جون جولائی ۱۹۶۱

حضرت حافظ مختار احمد صاحب شاہجہانپوری

المنار

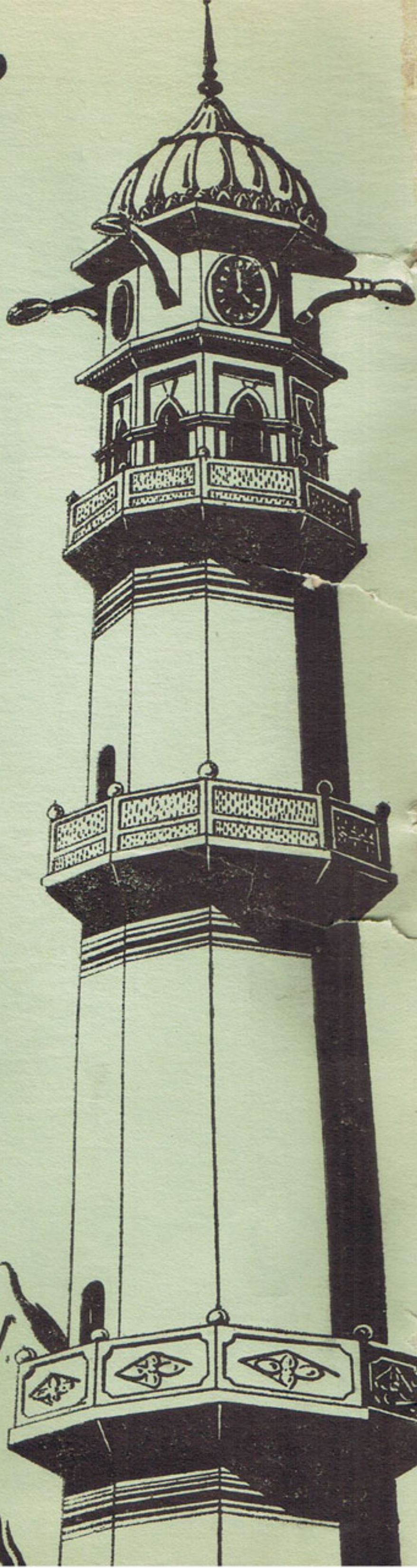

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون

(قرآن کریم - سورہ اعراف)

المنار

علم و عمل

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

نگران

محمد شریف خالد ایم اے ایل ایل بی

مدیر اعلیٰ

ارشد ترمذی

مدیر

رشید احمد جاوید

جلد ۱۲ — ۱۹۶۶ — نمبر ۳ و ۴

ترتیب

۱	اداریہ	ارشد ترمذی	۳
۲	جوہری توانائی	مرزا محمد رفیق	۹
۳	الیکشن	لطف الرحمٰن محمود	۲۲
۴	ایک عجیب مکالمہ	پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم اے	۲۶
۵	زوال کیوں؟	عطاء المجیب راشد	۲۹
۶	غزل	ارشد ترمذی	۳۳
۷	کوہساروں کے دامن میں	فضل خاں (دوازدہم)	۳۴
۸	هل جزاء الاحسان الا الاحسان	رضیہ احمد جاوید	۳۸
۹	ادب کی اہمیت	قریشی اعجاز الحق (بی اے سال دوم)	۴۲
۱۰	نئی صبح	عطاء الرحمٰن پرویز	۴۵
۱۱	خوش طبعی اور اسلام	مولانا ابو العطاء جالندھری	۴۷

غزلیات

۱۲	شیخ روشن دین تنویر	۴۹
۱۳	قاضی محمد ظہور الدین اکمل	۵۰
۱۴	مصلح الدین احمد راجیکی	۵۱
۱۵	ارشد ترمذی	۵۲
۱۶	مبارک احمد عابد	۵۳
۱۷	پروفیسر نصیر احمد خاں	۵۴
۱۸	.. ..	۵۵
۱۹	پروفیسر محمد شریف خالد	۵۶

پرنٹر و پبلشر: ۱۰-۷-۱۰ [illegible] (ستمبر اکتوبر) مطبع ضیاء الاسلام - ربوہ
[illegible] ربوہ میں چھپا۔

اداریہ

تعلیمی اصلاحات

قارئین الفضل جانتے ہیں تعلیمی اصلاحات نے ہمیں کس حد تک مقید کر دیا ہے۔ نئے تین سالہ ڈگری کورس کے لیئے ہر سال میں پانچ مقامی امتحانات پاس کرنا لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس اقدام نے ہماری درسگاہوں کو امتحان گاہوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ پھر لمبے لمبے سلیبس بخش کر ہمیں کتابی کیڑا بنانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ بتائیے کیا ایسے حالات میں ادبی حس کا مفلوج ہو جانا ایک طبعی امر نہیں ہے۔ ان اصلاحات نے طلباء کو مشکلات کے لامتناہی سلسلہ میں جکڑ دیا ہے۔ ایک تو طویل سلیبس ہے پھر نصاب میں وہ کتب شامل کی گئی ہیں۔ جو ابھی تک رود بار انگلستان سے اس پار نہیں آئیں ـــــ کیا ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے والے ارباب حل وعقد ان مشکلات کا حل تلاش نہیں کر سکتے؟ اگرچہ بعض احباب کی رائے میں نیا نظام تعلیم بی اے پاس کلرکوں کی بھیڑ کم کر دے گا مگر ہماری رائے میں جہاں یہ گریجویٹ کلرکوں کی بھیڑ کم کرے گا۔ وہاں میٹرک پاس چپڑاسیوں کی بھیڑ پہلے سے کئی گنا ہو جائے گی۔

طلباء اور دینیات

جس وقت انگریزی طریقہ تعلیم نوجوانان اسلام کی رگوں میں زہر کی طرح سرایت کرتا جا رہا تھا، جب طلباء مذہب کو چھوڑ کر دہریت کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ جب دنیوی تعلیم کی روزافزوں اہمیت نے دینی تعلیم کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ جب آثار بتا رہے تھے کہ انگریز کا بخشا ہوا نظام تعلیم ہمارے طلباء کو دین سے بالکل بے بہرہ بنا دے گا ایسے نازک حالات میں حضرت امام جماعت احمدیہ نے تعلیم الاسلام کالج کی بنا ڈالی۔ جس کا بنیادی مقصد ایک ایسی درسگاہ کا قیام تھا۔ جہاں دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے تاکہ ہمارے نوجوان ایک پاکیزہ اور مصفّٰے ماحول میں زیور علم سے آراستہ ہو سکیں۔ تعلیم الاسلام کالج قادیان (حال ربوہ) کے افتتاح کے موقع پر جماعت احمدیہ کے اولوالعزم امام نے فرمایا تھا:—

"ہمارا سارے کا سارا طریق اسلامی ہونا چاہیئے۔ بے شک ہندو، سکھ، عیسائی جو بھی آئیں ہمیں فراخدلی کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ مگر جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے۔ ان کے اخلاق سرتاپا مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ ان کی عادات مذہب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں اور ان کے افکار مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں"

پس تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی بنیادی غرض و نہایت بھی یہی ہے۔ کہ دہریت کا ابطال کر کے مذہب کی فضیلت کو ثابت کیا جائے۔

اسی مقصد کے حصول کے لئے کالج میں دینیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ہم سب کا فرض یہی ہے خواہ اساتذہ ہوں یا طلباء ہماری زندگی سرتاپا اخلاق فاضلہ کا مرقع ہو۔ ہمارے افکار، ہماری عادات، اور ہمارا اخلاق سرتاپا مذہب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔

پس جو طلباء یہاں آئیں وہ اپنے اندر یہ جذبہ لے کر آئیں۔ کہ انہوں نے یہاں آکر اس مقصد کو پورا کرنا ہے

تمام طلباء کو چاہیئے۔ کہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھیں اور اُسے زائد بار سمجھنے کی بجائے محنت اور توجہ سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ جب وہ یہاں سے رخصت ہو کر جائیں تو اُن کے دل اس خوشی سے معمور ہوں کہ انہوں نے اس درسگاہ میں آنے کے اصلی مقصد کو کماحقہ پورا کر دیا ہے۔

خراجِ تحسین

محکمہ تعلیم کے صوبائی سیکرٹری مکرم پروفیسر سراج الدین صاحب جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کے لیئے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے صدارتی ارشادات میں تعلیم الاسلام کالج اور اس کے منتظمین کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا اس کا مختصر سا خاکہ یہ ہے آپ نے فرمایا:۔

"سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمیشہ انسانوں ہی کے خلاف اس طاقت کو استعمال کیا ہے مگر مشینی جنت کے سراب میں کھونے سے نہیں بلکہ خالقِ حقیقی کی صحیح رنگ میں اطاعت اور اس سے کامل محبت کے ذریعہ ہی انسانیت کو تباہی سے بچایا جاسکتا ہے"

اسی طرح تعلیم الاسلام کالج کے متعلق فرماتے ہیں۔

"خالصۃً ذاتی عزم و کوشش کے نتیجہ میں ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج جیسی درسگاہ کو قائم کر دکھانا اور پھر اسے پہ ذان چڑھا کر اس کے

موجودہ معیار پر لانا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ تعلیم الاسلام کالج کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسے پرنسپل کی راہنمائی حاصل ہے جو ایمان و یقین، خلوص، فدائیت، اور بلند کرداری کے اعلیٰ اوصاف سے مالا مال ہے۔ آج ہم کو ایسے ہی باہمت، بلند حوصلہ اور اہل انسانوں کی ضرورت ہے۔ ہر چند مجھے پہلی بار تعلیم الاسلام کالج کی حدود میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں اور ان تمام لوگوں کے دلوں میں جو اس موجودہ تعلیم سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں محبت کا ایک خاص مقام ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم الاسلام کالج دو نمایاں اور ممتاز شخصیتوں والد اور فرزند — کی محنت اور محبت و شفقت کا ثمرہ ہے۔ میری مراد آپ کی جماعت کے واجب الاحترام امام جو اس کالج کے بانی ہیں اور ان کے لائق و فائق فرزند مرزا ناصر احمد سے ہے۔ وہ اپنے مشہور و معروف خاندان کی قائم کردہ روایات کو وقف کی روح اور ایک ایسے جذبہ و جوش کے ساتھ چلا رہے ہیں جو دوسرے ممالک میں بھی شاذ ہی نظر آتا ہے۔ جب میں اس کالج پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے انگلستان اور امریکہ میں علم کی ترویج اور اس کے فروغ سے متعلق انسانوں کے وہ عظیم محسن یاد آئے بغیر نہیں رہتے جنہوں نے خدا کی تقدیس اور بنی نوع انسان کی خدمت کی نیت سے آکسفورڈ کیمبرج اور ہارورڈ میں کالج قائم کئے خالصتہً ذاتی عزم و ہمت کے بل بوتے پر ربوہ میں ایسی درسگاہ قائم کر دکھانا ایک عظیم کارنامہ ہے اور پھر اس کی آبیاری کرنا اور پروان چڑھا کر اسے حسن و خوبی اور مضبوطی و استحکام سے مالا مال کر دکھانا اور بھی زیادہ قابل ستائش ہے۔ ایک ایسے پرائیویٹ ادارے کو دیکھ کر جو باہمی مخاصمت اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں سے پاک ہو اور جس کی تمام تر کوششیں اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کے لئے وقف ہوں "اتفاق" اور رشک کے جذبات کا ابھرنا ایک قدرتی امر ہے۔

آپ کے امام جماعت کو علم

اور اس کی ترویج سے جو محبت ہے۔ آپ کے پرنسپل صاحب اور ممبران سٹاف نیز ماہرین تعلیم بھی اس میں حصہ دار ہیں۔

"مرزا ناصر احمد جنہیں اپنے شاگردوں میں شمار کرنا میرے لئے باعث عزت ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان کے نامور ذی عمل اور ماہر تعلیم ہیں۔ یہ کالج کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ایک ایسے پرنسپل کی راہ نمائی حاصل ہے۔ جو اپنی زندگی میں آج کے دن تک بڑی مستقل مزاجی کیساتھ مقررہ نصب العین کے حصول میں کوشاں چلے آرہے ہیں۔ اور زمانے کے اُتار چڑھاؤ اُن کے لئے کبھی سدِّ راہ ثابت نہیں ہوسکے۔ اِن سے کم اہلیت اور کم عزم و حوصلہ کا انسان ہوتا تو زمانے کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے جو ایمان و یقین، فدائیت اور بلند کرداری کے اوصاف سے متصف ہوں۔

مرزا ناصر احمد سے تعارف اور اُن کی دوستی کے شرف سے مشرف ہونا عزم و ہمت کے از سر نو بحال ہونے کے علاوہ خود اپنے آپ کو اس مستقبل کے بارے میں جو زمانہ کے پریشان کن بادلوں کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ ایک پختہ اور غیر متزلزل اعتماد سے بہرہ ور کرنے کے مترادف ہے۔"

یہ ایک ایسے عظیم القدر ماہر تعلیم کے تاثرات ہیں۔ جس نے اپنی تمام زندگی تعلیمی خدمت میں بسر کی ہے۔ یہ اُن کے عظیم تجربہ کی بنا پر کہے ہوئے الفاظ ہیں۔ جو حقائق حاضرہ کے صحیح ترجمان ہیں۔ تعلیم الاسلام کالج جب تک قائم رہے گا ہمارے جلیل القدر پرنسپل کی خدمات کا اعتراف ہوتا رہیگا۔

مبارکباد

امسال بی اے فرسٹ ایر کے امتحان میں مکرم قریشی اعجاز الحق صاحب نے میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہے۔ ادارۂ المنار اس کامیابی پر محترم قریشی صاحب اور جناب پرنسپل صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہے۔ قریشی صاحب اس درسگاہ کے ہونہار طالب علم ہیں۔ پچھلے سال آپ نے ہائر سیکنڈری امتحان کے آرٹس گروپ میں بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔

معذرت

ہمیں بعض بزرگوں کی طرف سے مضامین برائے

اشاعت موصول ہوتے ہیں۔ جہاں ہم اپنے کرمفرماؤں کے ممنون ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے قیمتی خیالات سے ہمیں نوازا ہے۔ وہاں ہم اپنی مجبوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ المنار جو نوخیز طلبا کا رسالہ ہے۔ وہ ایسے مضامین کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں ایک مضمون مکرم کیپٹن ڈاکٹر محمد رمضان صاحب کا ہے جس میں انہوں نے محترم ڈاکٹر بدرالدین صاحب مرحوم و مغفور کی بیماری کے دوران پیش آمدہ مشکلات کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں بعض اصلاحی امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

دوسرا مضمون مکرم ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب کا ہے۔ جس میں انہوں نے قرآن کریم سے اور دیگر حوالوں سے استدلال کرکے عمر دنیا کے متعلق اعداد وشمار بہم فرماتے ہیں۔ ادارۂ المنار ان ہر دو مضامین کے شائع نہ کر سکنے پر فاضل مضمون نگار حضرات کی خدمت میں معذرت پیش کرتا ہے۔

تبصرہ

مکرم محترم سید عباس علی شاہ صاحب ربوہ ضلع جھنگ نے ایک کتابچہ بعنوان

خزائن آلِ محمدؐ

شائع کرکے عوام کو آلِ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے توکل۔ دعا اور عبادت میں انہماک سے روشناس کرایا ہے۔ زیر نظر کتابچہ میں حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی دو دعائیں ہیں۔ جن کا ترجمہ بھی فاضل مؤلف نے عربی عبارت کے نیچے درج کر دیا ہے۔ پہلی دعا میں قرآن کریم کے انوار اور خوبیوں کا ذکر ہے دوسری دعا میں رمضان کی برکات کا ذکر اور ان کے حصول کی تمنا ہے۔ ہر دو دعائیں نہایت ہی پیاری اور دلگداز ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر کتابچہ کی کتابت اور طباعت وغیرہ بھی جاذب نظر ہوتی۔ ہدیہ ۵ آنے ہے۔ یہ رسالہ مؤلف سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

باسکٹ بال

ربوہ میں شاید ہی کوئی اور کھیل اتنا مقبول ہو جتنا کہ باسکٹ بال۔ اس کھیل کی تمام تر ترقی اور مقبولیت مکرم خان نصیر احمد صاحب کی کاوشوں اور محترم پرنسپل صاحب کی مشفقانہ سرپرستی کی رہین منت ہے۔ ربوہ جیسے دور افتادہ قصبہ میں ہر سالہ آل پاکستان ٹورنامنٹ کروانا ایک کارنامہ ہے۔ انڈین وائی ایم سی اے کی ٹیم کا یہاں آکر میچ کھیلنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ باسکٹ بال کے حلقوں میں ربوہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ خود مقامی حلقوں میں یہ کھیل اتنا عام ہے کہ جس طرف جائیں باسکٹ بال کے پول نظر آتے ہیں۔ تعلیم الاسلام کالج کی کورٹس پاکستان کی بہترین کورٹس میں سے ہیں۔ ہر سکول اور جامعہ احمدیہ کے علاوہ مختلف سپورٹس کلب کے زیر اہتمام متعدد کورٹس بن چکی ہیں جن میں نہایت بڑے ذوق و شوق سے کھیل کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ربوہ میں باسکٹ بال کا مستقبل بڑا روشن ہے۔

قرار دادِ تعزیّت

حال ہی میں موت نے ہم سے ایک جلیل القدر بزرگ کو ہمیشہ ہمیش کیلئے جدا کر دیا ہے یعنی حضرت نواب محمد عبد اللہ خاں صاحب ۱۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو وفات پا گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

آپ حجۃ اللہ نواب محمد علی خان صاحب آف مالیر کوٹلہ کے فرزند تھے۔ آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دامادی کا شرف حاصل تھا۔ آپ نے تمام عمر جماعت کی بے لوث خدمت کی۔ صدر انجمن احمدیہ پاکستان کے پہلے ناظر اعلیٰ کی حیثیت سے آپ کی عظیم خدمات کا اعتراف ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ آپ کی وفات پر تعلیم الاسلام کالج کے طلباء اور اساتذہ نے مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی:۔

"تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ اور طلباء حضرت نواب محمد عبد اللہ خاں صاحب کی المناک وفات پر اپنے دلی رنج و غم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت نواب صاحب کے قیمتی وجود کا ہمارے درمیان سے رخصت ہو جانا ہمارے لئے ایک سخت نقصان ہے۔ آپ اپنی شرافت و نجابت، نیکی، تقوےٰ اور بزرگی کے اعلیٰ مقام کے لحاظ سے جماعت کے لئے مشعلِ راہ تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اپنی رحمت اور فضل سے نوازے۔

اساتذہ اور طلباء کا یہ اجلاس حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سارے خاندان اور بالخصوص بیگم صاحبہ حضرت نواب صاحب مرحوم اور آپ کے بچگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ ان سب کا حامی و ناصر ہو۔ اور انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔"

مرزا محمد رفیق
بی۔ایس سی

جوہری توانائی

یہ مضمون اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقدہ مقابلہ میں سوم رہا۔ جسے قارئین المنار کے افادہ کیلئے پیش کیا جا رہا ہے

([illegible])

انسانی شعور کی ارتقائی منازل کے دور پر جب ہم غور کرتے ہیں۔ تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ غاروں میں رہنے والے انسانوں کا شعور ایسا تھا۔ کہ جب وہ آگ کو دیکھتے ہیں۔ تو ڈر جاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں۔ کہ شاید یہ کوئی مافوق الفطرت چیز ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس کی پوجا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد چند سمجھدار اشخاص نے سوچا۔ کہ یہ کیا چیز ہے؟ اسے کیسے قابو کیا جائے؟ مزید براں اس کو استعمال میں کیوں نہ لایا جائے۔ مگر عام خیال کے مطابق ان مفکرین کا تجسس بے فائدہ تصور کیا گیا۔ لیکن جب آگ کو قابو کر لیا گیا۔ اور استعمال میں لایا گیا۔ تو یہی ان کے لئے آرام کا باعث بنی۔ اور ضروریات زندگی میں سے ایک چیز ثابت ہوئی۔ مادہ تجسس قدرتی طور پر جذبۂ اتم انسانی دماغ میں شروع ہی سے رکھا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ قدیم زمانہ میں تجسس محدود تھا اور فی زمانہ شعور بیدار ہو چکا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ جو بھی ترقی کی گئی ہے وہ اسی انسانی تجسس کی کاوش کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے۔

انسانی شعور کا ارتقا جاری رہا۔ آگ سے مفید کام لئے گئے۔ آگ سے حرارت حاصل کی گئی اس کی ماہیت پر بھی غور کیا جانے لگا۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے لکڑی کا استعمال شروع ہوا۔ ابتدائی دور میں لکڑی کی فراوانی تھی۔ مزید کسی اور چیز کی دریافت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن چند صدیوں کے بعد انسانی شعور کچھ اور بیدار ہوا۔ تو اس وقت انسان کو محسوس ہوا۔ کہ کوئی اور چیز دریافت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ لکڑی ختم ہو جائے۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ لکڑی زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ کوئلہ دریافت کر لیا گیا۔ اور اس پر تحقیقات کی گئیں۔ انسان پتھر کے دور سے نکل کر بھاپ کے دور میں داخل ہوا۔ تو صنعتی انقلاب رونما ہوئے۔ تجسس اور تحقیقات بڑھتے گئے۔

تیل جب دریافت کر لیا گیا۔ تو اس کو ایسے انداز میں استعمال کیا گیا کہ اکثر اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئیں۔

خدشہ باقی رہا۔ کہ کوئلہ اور تیل کے ذخائر بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ تو برقی قوت پیدا کی گئی اور برقی قوت پیدا کرنے میں کوئلہ تیل اور بہتے ہوئے تیز رو دریاؤں کے پہاڑی راستوں کو استعمال کیا گیا۔ لیکن انسان کا تجسس پھر بھی شعور پر بھوت بن کر سوار رہا۔ اور مزید تحقیقات جاری رہیں۔ اور آخر کار موجودہ صدی میں انسان ایک قوت کا خزانہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ شاید ہم اب یہ امید کریں۔ کہ ہماری تمام ضروریات زندگی پوری ہو جائیں گی۔ ہرگز نہیں! لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آئندہ تحقیقات ترک کر دیں، ہرگز نہیں!! بلکہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ یہ جوہری توانائی نظریہ دو ہزار برس سے بھی زیادہ عرصہ کے مفکر لوگوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور بیسویں صدی میں جوہری توانائی پر تحقیقات اپنے عروج پر ہیں۔ اور مزید سائنسدانوں کی محنت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے بیسویں صدی سے پہلے تحقیقات نہ ہونے کی وجوہات غالباً یہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اجتماعی کوشش نہ کی گئی۔ دوسرے ذرائع محدود تھے۔ تیسرے شعور کم بیدار تھا۔ اور چوتھے غالباً ضروریات بھی محدود تھیں۔

اس تعارف کے بعد اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ یہ جوہری توانائی کیسے دریافت کی گئی ہے۔

یوں تو تحقیقاتی تجسس انسان میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے لیکن باشعور طبقہ نے تجسس کو بروئے کار لا کر نت نئی چیزیں دریافت کیں اور نئے نظریات پیش کئے۔ اجتماعی جد و جہد جاری رہی۔ اگر ایک اکیلا انسان کوشش کرے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں تمام مسائل حل کر جائے۔ غالباً ناممکن ہوگا۔ لیکن اگر ہم اجتماعی جد و جہد کریں تو آہستہ آہستہ تمام مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ ہم کچھ گذشتہ مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے کچھ نئی دریافت بھی کریں۔ نئے نظریات قائم کریں۔ اور کچھ مسائل آئندہ لوگوں کے لئے پیدا کر جائیں۔ اس طرح مزید ترقی کا دروازہ کھلا رہے گا۔

قدیم یونانی فلاسفر ڈیموکریٹس کا نظریہ تھا۔ کہ تمام چیزیں بہت ہی چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہیں۔ جس کو اس نے جوہری ذرہ (ATOM) کا نام دیا اور جس کو وہ غیر منقسم خیال کرتا تھا۔

ایک اور یونانی فلاسفر ارسطو کا خیال تھا کہ تمام چیزیں ہوا۔ آگ۔ پانی اور مٹی سے مل کر بنی ہیں یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے۔

اس کے بعد رومی فلاسفر لوکریشس کا خیال تھا۔ کہ تمام چیزیں ایسے نہ نظر آنے والے ذرات سے مل کر بنی ہیں۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اور آسانی سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال ڈیموکریٹس کے نظریہ سے مطابقت

رکھتا ہے۔ لیکن یہ جوہری ذرات کی مضبوط پکڑ کا قائل تھا۔ اور نہ جدا ہونے والے ذرات تصور کرتا تھا۔

اس کے بعد اسلامی دور شروع ہوتا ہے اور اس دور کے سائنسدانوں کو الکیمیا (Alchemists) کہا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کیمیائی میدان میں ان مسلمانوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نمک، گندھک اور شورے کے تیزاب تیار کر لئے تھے۔ اور ان کی مدد سے ہزاروں کیمیائی مرکبات تیار کئے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آج بھی تینوں تیزاب کیمیائی تحقیقات میں بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مثلاً ماءالملوک (Aqua Regia) یہ ایسا مرکب ہے جس میں سونا حل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سونا کسی اور مائع میں حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ طب، فلسفی، ریاضی، طبقات، علم نجوم، علم سیارگان، علم تاریخ، علم ہندسہ، تعمیرات، صنعت و حرفت اور سیاسیات، غرضیکہ ہر میدان میں ترقی کی۔ آنے والے لوگوں کے لئے بے انتہا تحقیقات کے میدان ہموار کر گئے۔

ہمارے مقالہ کے لئے دراصل ان کی یہ کوشش کہ ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں کیسے تبدیل کیا جائے۔ قابل غور ہے۔ جس کو ہم انگریزی میں Transmutation of Elements کہتے ہیں۔ الکیمیا یہ چاہتے تھے کہ دیگر عناصر سے سونا تیار کیا جائے۔ وہ اسی مسئلہ پر صدیوں تک تحقیقات کرتے رہے۔ لیکن کیمیائی طور پر غالباً یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کامیاب بھی ہو گئے ہوں لیکن وہ سونا ضرور مہنگا پڑا ہوگا۔ الکیمیا تقریباً پندرھویں صدی عیسوی تک کام کرتے رہے۔ دنیا تسلیم کرتی ہے کہ قرون وسطیٰ کی تحقیقات نے بڑی مدد دی ہے۔

سترھویں صدی میں مسٹر پیری گاسینڈی (Pierre Gassendi) نے پھر سے ڈیموکریٹس اور لوکریٹس کے نظریات پر تحقیقات شروع کی گئیں۔ اُدھر آئرلینڈ کے مسٹر (Boyle) نے خیال ظاہر کیا کہ تمام اشیاء ضرور جوہری ذرات پر مشتمل ہیں۔ اور جب ایک چیز دوسری چیز سے ملتی ہے۔ تو جوہری ذرات ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ اسی دوران میں برطانیہ کے سر نیوٹن (Newton) نے نظریہ پیش کیا کہ روشنی کی شعاع جوہری ذرات کے مجموعہ (Corpuscles) ہوتے ہیں۔ یعنی کئی جوہری ذرات مل کر ایک گچھے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں اٹلی کے مسٹر وولٹا (Volta) نے دریافت کیا۔ کہ جب برقی کسی محلول سے گزاری جائے۔ تو یہ وہ اس جوہری مرکب (Molecule) کو اس کے عنصری جوہری ذرات میں تقسیم

اسی بنا پر ان کو خیال پیدا ہوا ۔ کہ جوہری ذرات مثبت اور منفی پر مشتمل نہ ہوں گے۔

انیسویں صدی میں برطانیہ کے مسٹر ڈالٹن (Dalton) نے دریافت کر لیا کہ اگر کیمیائی عناصر ملتے ہیں تو ان کے خواص نسبتی اوزان کیمیائی عمل میں حصہ لیں گے۔ اسی بنا پر نتیجہ اخذ کیا ۔ کہ ایک عنصر کے جوہری ذرات یکساں ہوتے ہیں ۔ ادھر اٹلی کے مسٹر ایوگیڈرو (Avogadro) نے مختلف عناصر کی جوہری ترتیب پر تحقیق کی اور پانی کے متعلق مندرجہ ذیل ترتیب پیش کی ۔

آکسیجن کا ایک جوہری ذرہ + ہائیڈروجن کے دو جوہری ذرات = پانی کا ایک جوہری مرکب (Molecule)

ایک انگریز مسٹر براؤن (Brown) نے معلوم کیا کہ جوہری مرکب حرکت کرتے ہیں ۔ فرانس کے مسٹر بیک ورل (Bequerel) نے دریافت کیا کہ یورینیم کے مرکبات فوٹو پلیٹ پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اور اس کو اس نے تابکاری (Radio Activity) کا نام دیا ۔ یہ بہت بڑی دریافت تھی ۔ ایک اور انگریز مسٹر جے جے تھامسن (J.J. Thomson) نے دریافت کیا ۔ کہ جوہری ذرہ دو حصوں پر مشتمل ہے ۔ ایک الیکٹرون (Electron) اور دوسرا پروٹون (Proton) ذرہ ہوگا ۔ کچھ عرصہ بعد جرمن کے مسٹر رونٹجن (Roentgen) نے ایسی شعاع دریافت کیں ۔ جن کو ایکس شعاع (X-Ray) کا نام دیا گیا ۔ اس کی لہر کی لمبائی بہت ہی کم ہے ۔ لہذا وہ سب سائنسدانوں نے خیال کیا ۔ کہ یہ شعاع ضرور جوہری خاکہ رکھتی ہوں گی ۔

اسی عرصہ میں فرانسیسی پیری اور میڈم کیوری (Piere & Marie Curie) نے ریڈیم عنصر دریافت کر لیا ۔ اور مطالعہ کرنے پر یہ نتیجہ نکالا کہ ریڈیم جوہری نمبر ۸۸ ، یورینیم جوہری نمبر ۹۲ سے زیادہ تابکار ہے ۔۔۔ لیکن یہ سوال باقی رہا ۔ کہ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

اب ہم بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں ۔ یہاں تو غالبًا ترقی اور تحقیقات کی رفتار اتنی تیز ہوئی ۔ کہ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی چیز دریافت ہونے لگی !

اس صدی میں ایک انگریز مسٹر رودر فورڈ (Rutherford) نے دریافت کیا ۔ کہ ریڈیم کس قسم کی شعاع ریزی کرتا ہے ۔ اور اس شعاع ریزی کی ماہیت کیا ہے ۔ لہذا اس نے تین قسم کی شعاع دریافت کیں ۔ اور ان کو (ا ۔ ب ۔ ج) (αβγ) الفا، بیٹا، گیما شعاع کا نام دیا ۔ یہ تابکاری اثر رکھتی ہیں ۔ اور مختلف خواص کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہیں اور دوسرے عناصر کے ساتھ عجیب و غریب

..تا خزانہ پیدا کرتی ہے۔ ہمارا ان سے اتنا تعلق ہے۔ کہ مسٹر ردر فورڈ نے الفا شعاع کو جوہری ذرہ کے مطالعہ میں استعمال کیا۔ اور وہ جوہری ذرہ کا مرکز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کو مرکزیہ (Nucleus) کا نام دیا۔ یہ کل جوہری ذرے کے دس ہزارویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔

اب انیس سو تیرہ میں ڈینش سائنسدان نیلز بوہر (Neils Bohr) نے ایک جوہری خاکہ پیش کیا جو کہ ہمارے نظام شمسی کے مطابق تھا۔ اور تمام گذشتہ حقائق کی پیروی کرتا تھا۔

جوہری ذرے کا ایک مرکزیہ ہوتا ہے جس میں پروٹون ذرہ موجود ہوتا ہے۔ اور الیکٹرون اس مرکزے کے گرد گھومتا ہے۔ اس کی حرکت کے مختلف مداری راستے ہو سکتے ہیں۔ جو کہ مختلف سطحوں پہ ہوں گے۔ اب الیکٹرون ذرہ کو مداری گھومتے رکھنے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت ہے۔ الیکٹرونی ذرہ منفی برقیہ رکھتا ہے۔ اور مرکزیہ پروٹون ذرہ کی موجودگی میں مثبت برقیہ رکھتا ہے۔ لہذا برقی کشش الیکٹرونی ذرات کو مداری حرکت میں رکھیگی اس کے علاوہ مرکزی کشش (Centri- petal Force) الیکٹرونی ذرہ کو اپنی مداری سطح سے باہر نہ جانے دیگی

شکل ایسے ہو سکتی ہے :-

یہ خاکہ تقریباً ہر جوہری ذرہ کا ہوتا ہے

اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ایک اور انگریز سائنسدان مسٹر جیمز چیڈوک (Chadwick) نے ایک ذرہ دریافت کر لیا۔ جس کو اس نے نیوٹرون ذرہ (Neutron) کہا۔ جو کہ مثبت اور نہ ہی منفی برقیہ رکھتا ہے۔ یہ مرکزیہ میں پایا جاتا ہے۔ لہذا جوہری خاکہ میں تجدید کر دی گئی۔ مرکزیہ میں صرف پروٹون ذرہ کی بجائے ایک اور ذرہ یعنی نیوٹرون کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ یوں تو مرکزے میں اور ذرات بھی دریافت ہوئے ہیں۔ پوزیٹرون ذرہ ([illegible]) اور میزون ذرہ (Meson) وغیرہ۔ لیکن عملی طور پر جہاں تک جوہری خاکہ کا تعلق ہے مندرجہ ذیل خاکہ سب تسلیم کر چکے ہیں :-

لہٰذا اسی بنیاد پر ہم مختلف جوہری ذرات کے خاکوں کا مطالعہ کریں گے۔ جوہری ذرہ کی مختلف مداری سطحوں پر الیکٹرون کی تعداد کا تعین مندرجہ ذیل کلیہ سے کرتے ہیں :۔

الیکٹرون ذرات کی تعداد $= ۲ \times ن^{۲}$

اب پہلی سطح پر الیکٹرون $= ۲ \times ۱^{۲} = ۲$

دوسری سطح پر الیکٹرون $= ۲ \times ۲^{۲} = ۸$ (ن = ۱، ۲، ۳۔۔۔)

تیسری سطح پر الیکٹرون $= ۲ \times ۳^{۲} = ۱۸$

اسی طرح دوسری سطحوں پر الیکٹرونی ذرات کی تعداد معلوم کی جاسکتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ پہلی سطح پر دو۔ دوسری پر آٹھ۔ تیسری پر اٹھارہ۔ آخری پر آٹھ اور آخری سے ایک کم پر اٹھارہ اور دو کم پر بتیس سے زیادہ الیکٹرونی ذرات برقرار نہیں رہ سکتے۔ ہم اس کو دوسرے طریقے سے لکھ سکتے ہیں :۔

نمبر شمار	عنصر	جوہری نمبر پروٹون	نیوٹرون	جوہری وزن کمیت	تعداد الیکٹرون	جوہری خاکہ
۱	ہائیڈروجن (H)	۱	–	۱	۱	۱
۲	آکسیجن (O)	۸	۸	۱۶	۸	۲ ، ۶
۳	لوہا (Fe)	۲۶	۳۰	۵۶	۲۶	۲ ، ۸ ، ۱۴ ، ۲
۴	سونا (Au)	۷۹	۱۱۸	۱۹۷	۷۹	۲ ، ۸ ، ۱۸ ، ۳۲ ، ۱۸ ، ۱
۵	سیسہ (Pb)	۸۲	۱۲۵	۲۰۷	۸۲	۲ ، ۸ ، ۱۸ ، ۳۲ ، ۱۸ ، ۴
۶	یورینیم (U)	۹۲	۱۴۶	۲۳۸	۹۲	۲ ، ۸ ، ۱۸ ، ۳۲ ، ۲۱ ، ۹ ، ۲

مندرجہ بالا چارٹ سے ہم مندرجہ ذیل کلیہ اخذ کرتے ہیں :۔

جوہری وزن (نمبر) = پروٹون ذرات + نیوٹرون ذرات

اس سے ہم جوہری نمبر بھی نکال سکتے ہیں۔

پروٹون ذرات یا جوہری نمبر = جوہری وزن نمبر - نیوٹرون ذرات۔

اسی سال ایک امریکی سائنسدان ہیرلڈ یورے (Harold Urey) ہائیڈروجن کے جوہری ذرہ

کے مرکزے میں ایک مزید نیوٹرون ذرّہ داخل کر کے ہائیڈروجن کا بھاری جوہری ذرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس بھاری ہائیڈروجن کے جوہری ذرّہ سے بھاری پانی حاصل کر لیا۔

لہٰذا ایک عنصر کو دوسرے نئے عنصر میں تبدیل کرنا آسان ہو گیا۔ اور قرونِ وسطیٰ کے الکیمیا کا جواب پیدا ہوا۔ لہٰذا اگر ہم سیسہ کے مرکزے جس کا جوہری نمبر ۸۲ ہے سے تین عدد پروٹون ذرّات نکال لیں تو وہ ایک نیا عنصر جس کا جوہری نمبر ۷۹ ہے بن جائے گا۔ اور وہ سونا! کتنی بڑی کامیابی ہے!! لیکن اس طرح سونا بنانے میں قیمت زیادہ خرچ ہوتی ہے —— اب ہماری تمام تر توجہ جوہری توانائی کے مرکزی خزانہ کے حصول پر مرکوز ہو گی۔

۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ جرمنی میں دو سائنسدان مسٹر ہان (Mr. Hahn) اور مسٹر سٹراس مین (Strassmann) یورینیم کے جوہری ذرہ کو نیوٹرونی ذرّہ سے ٹکرا کر توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس عمل کو جوہری افشا یا جوہری انتشار (Atomic fission) کا نام دیا گیا لیکن جوہری افشا کو قابو نہ کر سکے۔ جب تک یہ قابو نہ کیا گیا۔ اس وقت اس کا ایک ہی جگہ استعمال کیا۔ وہ ہے جوہری بم (Atom Bomb) کا بنانا، جس کی مثال دو جوہری بم تھے جو کہ دوسری جنگِ عظیم اختتامی ایام میں ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکہ نے گرائے تھے۔ اور جب ان کے نتائج پر غور کیا گیا۔ تو تمام انسانیت کو خطرہ میں پایا۔ جس سے لوگوں کو تباہی کا خطرہ محسوس ہوا۔ اور دوسری طرف جنگ سے نفرت بڑھ گئی۔ شاید اسی لئے جوہری توانائی کے پُر امن استعمال کی طرف انسانی رجحان بڑھ رہا ہے۔ اور امید ہو چلی ہے۔ کہ اب پُر امن استعمال میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو گی۔ لیکن اکثر اقوام ابھی تک جوہری ہتھیاروں کے تجربات جاری رکھ کر ہمارے مستقبل کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اس کا یہی علاج ہو سکتا ہے۔ کہ خدا کا خوف پیدا ہو۔ اور جوہری توانائی پہ بین الاقوامی کنٹرول ہو۔ اس کے علاوہ تخفیفِ اسلحہ پر بھی غور کیا جائے۔

بعد ازاں ۱۹۴۲ء میں اٹلی کے سائنسدان مسٹر فرمی شکاگو یونیورسٹی میں باقابو جوہری "انتشار" جوہری بھٹی (Atomic Reactor) میں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تاریخی تجربہ نے ہمارے لئے بے انتہا ترقی کی راہیں وا کر دیں اب تقریباً ہر شعبہ میں خواہ صنعت و حرفت ہے یا زراعت، خواہ انجینئری ہے یا طب، جوہری توانائی کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔

اب ہم غور کریں گے کہ جوہری توانائی حاصل کرنے میں کس حد تک تحقیقات ہوئی ہیں اور جوہری توانائی جوہری انتشار سے کیسے حاصل ہو سکتی ہے کیا اس کے علاوہ اور بھی طریقہ ہو سکتا ہے جس سے جوہری توانائی حاصل ہو سکتی ہے اور اس کو کہاں اور

کیسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے؟

جب ہم یورینیم کے جوہری ذرہ کو نیوٹرون ذرہ سے ٹکراتے ہیں۔ تو یورینیم دو قسم کے نئے عناصر میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ تین عدد نیوٹرون ذرات بھی مزید برآمد ہوتے ہیں۔ دو نئے عناصر بیریم اور کرپٹون ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ابتدائی یورینیم کے وزن سے ماحصل کا وزن کچھ کم ہوگا ـــــ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جوہری انتشار کے بعد ماحصل کا وزن کم کیوں ہوا۔ اور اس کمیت کا کیا بنا؟ ـــــ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ کمیت (M) جو کمی واقع ہوتی ہے وہ جوہری توانائی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے (اس کو جوہر کی مرکزی قوت بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ مرکز سے حاصل ہوتی ہے) اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کمیت آئین سٹائین کے کلیہ کے مطابق توانائی میں تبدیل ہوتی ہے۔

کلیہ یہ ہے

توت = ک × ر[2] یعنی جوہری توانائی = کمیت × (روشنی کی رفتار)[2]

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل فی سیکنڈ ہے۔ جس کا مربع (۳۴۵۹۶۰۰۰۰۰۰) ہوتا ہے۔ لہذا کمیت کو اسی مقدار سے ضرب دینا ہوگی تو اتنی توانائی حاصل ہوگی۔ اندازہ کیجئے کہ ایک پونڈ ایندھن سے کتنی توانائی پیدا ہوگی۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ایک پونڈ جوہری ایندھن سے اتنی توانائی پیدا ہوگی۔ جتنی دو لاکھ ٹن کوئلہ کو جلانے سے حاصل ہوگی۔ اور اگر ایک پونڈ غیر مستقل یورینیم کے جوہری ذرات کو توڑا جائے تو اتنی توانائی حاصل ہوگی جتنی کہ ایک ہزار ٹن کوئلہ کو جلانے سے حاصل ہوگی۔

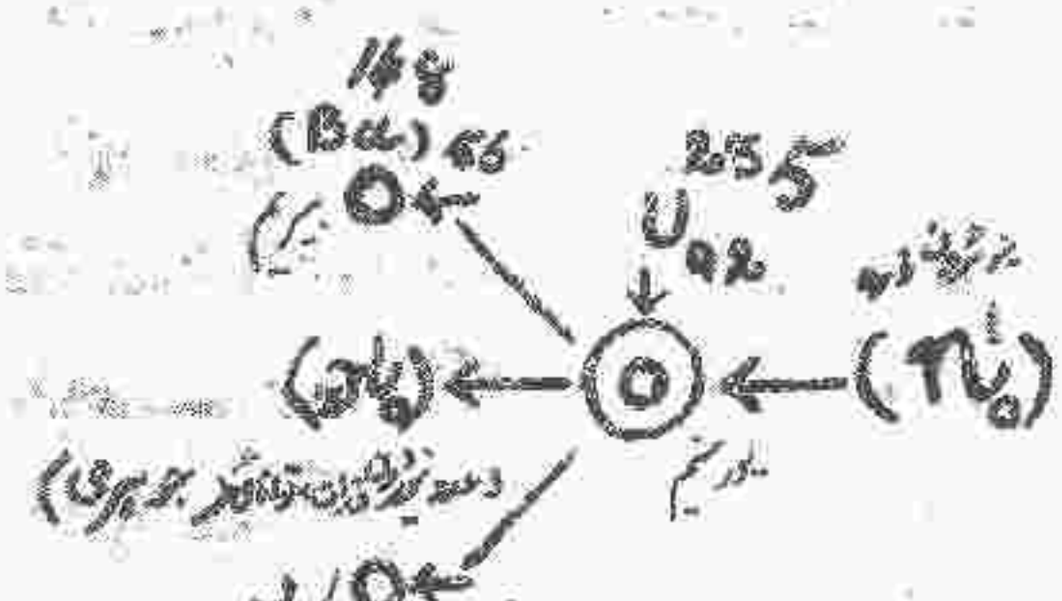

یورینیم کا جوہری نمبر ۹۲ اور جوہری وزن ۲۳۵
بیریم ۰ ۰ نمبر ۵۶ ۰ ۰ ۱۴۰
کرپٹان ۰ ۰ نمبر ۳۶ ۰ ۰ ۹۳ ہوگا

اس جوہری انتشار کے علاوہ ایک طریقہ اور بھی معلوم کیا گیا ہے جس کو جوہری ملاپ (fusion) کا نام دیا گیا۔ اس جوہری ملاپ سے پہلے بھاری ہائیڈروجن کا جوہری ذرہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور پھر ہائیڈروجن کے دو جوہری ذرات کو کثیر حرارت اور دباؤ کے تحت ملا کر ایک ہیلیم (He) کا جوہری ذرہ حاصل ہوتا ہے۔ تو اس وقت جوہری توانائی جوہری انتشار کی توانائی کی نسبت کئی گنا زیادہ حاصل ہوگی۔ لیکن اس عمل کے لئے ابتدائی حرارت اور دباؤ کا ہونا لازمی ہے۔ یہی عمل سورج میں واقع ہوتا ہے۔ جہاں جوہری ملاپ ہر وقت جاری ہے

اور لامتناہی توانائی اس کائنات میں سورج سے نکل کر اشعاع کی صورت میں پھیلتی رہتی ہے۔ اس توانائی پر ہماری کائنات کی زندگی کا انحصار ہے واضح رہے کہ ابھی اس عمل پر قابو نہیں پایا جاسکا اس لئے فی الحال ہم باقابو جوہری انتشار ہی سے توانائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

باقابو جوہری انتشار کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

یہ ایسے ممکن ہے۔ کہ زنجیری تعامل (Chain Reaction) کو قابو کیا جاتا ہے۔ زنجیری تعامل اکثر حالات میں ضروری ہوتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اگر کوئلہ جلایا جائے اور زنجیری تعامل نہ ہو۔ تو کوئلہ تمام جلنے سے پہلے ہی بجھ جائے گا۔ کوئلے کو مکمل طور پر جلانے کے لئے زنجیری تعامل ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم دہکتے ہوئے کوئلوں میں مزید کوئلے ڈال دیں۔ تو یہ جلنے کا عمل جاری رہے گا۔ یہ اصل کوئلوں کا جلنا زنجیری تعامل کی وجہ سے جاری رہتا ہے۔ اور غالباً جوہری انتشار پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس عمل کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئلہ کا کاربن عنصر غیر مستقل ہے۔ اور مرکزی توانائی فوراً ہی برآمد کر دیتا ہے۔ اور یہ توانائی روشنی کی اشعاع کی صورت میں فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اس کو بعض اوقات ہم قابو میں رکھنا چاہتے ہیں تو کئی طریقے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً یا تو کوئلوں کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت میں استعمال کرتے ہیں اور ذرا دور فاصلے پر رکھ کر جلاتے ہیں یا کوئی اور چیز ایسی ملا دیتے ہیں جو کوئلوں کو جلدی نہ جلنے دے۔ یعنی لکڑی کے ٹکڑے بھی ساتھ ڈال دیئے جاتے ہیں۔ بہرحال موقع کے مطابق مناسب طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر زیادہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو کافی کوئلے کھلے رکھ کر جلائے جاتے ہیں اور اگر اس سے بھی زیادہ حرارت کی ضرورت ہو تو کوئلوں کو بالکل باریک پیس کر بھٹی میں داخل کیا جاتا ہے۔ ایسا طریقہ عموماً بند قسم کی بھٹیوں میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً سیمنٹ کو پھونکنے کے لئے پسا ہوا کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے اور تقریباً ۱۴۰۰ درجہ حرارت حاصل کر لیا جاتا ہے اب عمل کو قابو کرنے والے مادہ کو ہم ضبط کار مادہ (Moderator) کے نام سے موسوم کریں گے اس تشریح پر غور کرنے کے بعد ہمیں زنجیری تعامل کی اور ضبط کار مادہ کی سمجھ آجاتی ہے۔ اب ہم جوہری بھٹی کے متعلق بات کرتے ہیں۔

جوہری بھٹی دراصل وہ مشین ہے۔ جس میں جوہری ذرات کے ٹوٹنے کے باقابو عمل کے ذریعے جوہری ذروں میں بند توانائی کو آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۱) ایک مرکزی حصہ جس میں انتشار پذیر جوہری ایندھن رکھا جاتا ہے۔ اور زنجیری تعامل وقوع پذیر ہوتا ہے۔

(۲) مطالوں کا ایک ایسا نظام جس کے ذریعے

تپش، مرکزی حصے سے منتقل کی جاتی ہے۔

(۳) سیمنٹ یا سیمنٹ اور روڑی کی بنی ہوئی ایک حفاظتی دیوار تاکہ وہ خطرناک تابکاری اشعاع کو نکلنے سے روک سکے۔

(۴) کیڈمیم سلاخیں یا اس جیسے نیوٹرون ذرات کو جذب کرنے والے مادہ کی بنی ہوئی ایک یا ایک سے زیادہ بھٹی کے مرکز میں رکھی جاتی ہیں۔ اور وہ باہر بھی نکالی جا سکتی ہیں۔

(۵) ایک عام قسم کے بجلی گھر میں مرکزی حصے کی تپش کو نلکوں کے ذریعے حرارت منتقل کرنے والے حصے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے بھاپ پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے پھر اس بھاپ کو ایک بھاپ چرخ سے چلنے والے برقی تیز آلات میں بجلی کی قوت پیدا کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جوہری بھٹیوں کو عموماً تین خصوصیات کی بنا پر الگ الگ تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) بھٹی میں کونسا ایندھن استعمال ہوتا ہے

(۲) بھٹی کی اندرونی توانائی کو منتقل کرنے کیلئے کیا ترکیب اور کون سی چیز استعمال کی گئی ہے۔

(۳) بھٹی میں نیوٹرون ذرات کی رفتار کو ڈھیلو کرنے کے لئے کون سا مادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں سیال مادہ کو بطور ایندھن استعمال کرنے کے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ اس میں یورینیم کو سیال یا مائع کی شکل میں استعمال کیا گیا ہے۔ جو شاید ور [illegible] تک حرارت منتقل کرنے کے لئے ہوا، پانی اور بعض سیال دھاتوں کو آزمایا گیا ہے۔ نیوٹرون ذرات کی رفتار کو کم کرنے کے لئے گریفائٹ ([illegible]) سادہ پانی اور بھاری پانی استعمال کیا گیا ہے۔

(۳) ایسی جوہری بھٹیاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں نیوٹرون ذرات اپنی پوری رفتار (ہزاروں میل فی سیکنڈ) سے استعمال میں لایا جا سکے۔ یہ افزائشی بھٹی ([illegible]) کہلاتی ہے۔ اس سے در اصل برقی قوت پیدا کی جائے گی۔

(۴) کو افزائشی بھٹی اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جوہری انتشار صرف یورینیم کے (۲۳۵) جوہری وزن والے ہجا کو رکھ دیا جاتا ہے۔ جو نیوٹرون ذرات کی شدید گولہ باری سے ایک اور عنصر نیوٹونیم ([illegible]) جوہری نمبر ۹۳ اور جوہری وزن (۲۳۹) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس کا جوہری ذرہ بالکل آسانی سے جوہری انتشار میں حصہ لیتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی بھٹی کو "افزائشی بھٹی" کہا گیا ہے۔

آب جوش بھٹی ———— اس میں بھاپ بھٹی کے اندر ہی بنائی جاتی ہے۔ اور پھر بھاپ چرخ سے چلنے والے برقی تیز آلات سے برقی قوت پیدا کی جاتی ہے

تیسری قسم تحقیقاتی اور تربیتی بھٹیاں کہلاتی ہیں۔ یہ بھٹیاں تحقیقاتی کام میں اور کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں تربیتی پروگراموں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

ایک اور قسم کی بھٹی بھی تیار کی گئی ہے جس میں ضبط کرنے والے مادے ٹھوس یا سیال شکل

میں استعمال ہوتے ہیں - انتشار پذیر مادے کو سلاخوں کی صورت میں تیار کیا جاتا ہے - اور یہ سلاخیں ضبط کرنے والے مادے کے بیچ میں رکھی جاتی ہیں - اس کو سمجھنے کے لئے آپ شہد کے چھتے پر غور کیجئے گا - اس میں انتشار پذیر مادہ شش پہلو خانوں کی پتلی دیواریں ہوں گی - جن کے درمیان برابر کا فاصلہ ہوتا ہے - ان دیواروں کے درمیان بھرا ہوا مادہ ضبط کرنے والی اشیاء ہوں گی - یہ متفرق الاجزا جوہری بھٹی اچھی خاصی تصویر ہوگی -

(اسی بلاک کے گرد سیمنٹ کنکریٹ کی دیوار بنی ہوتی ہے)

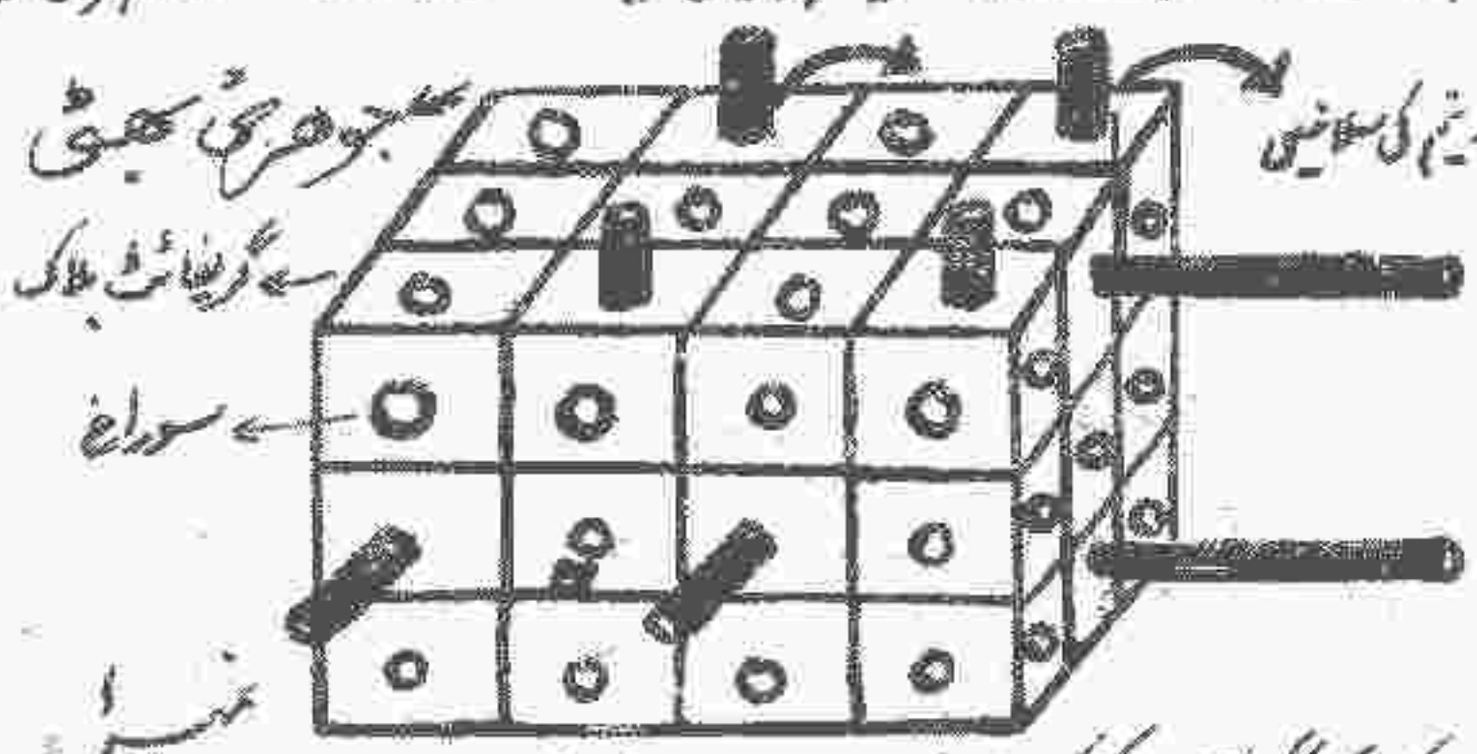

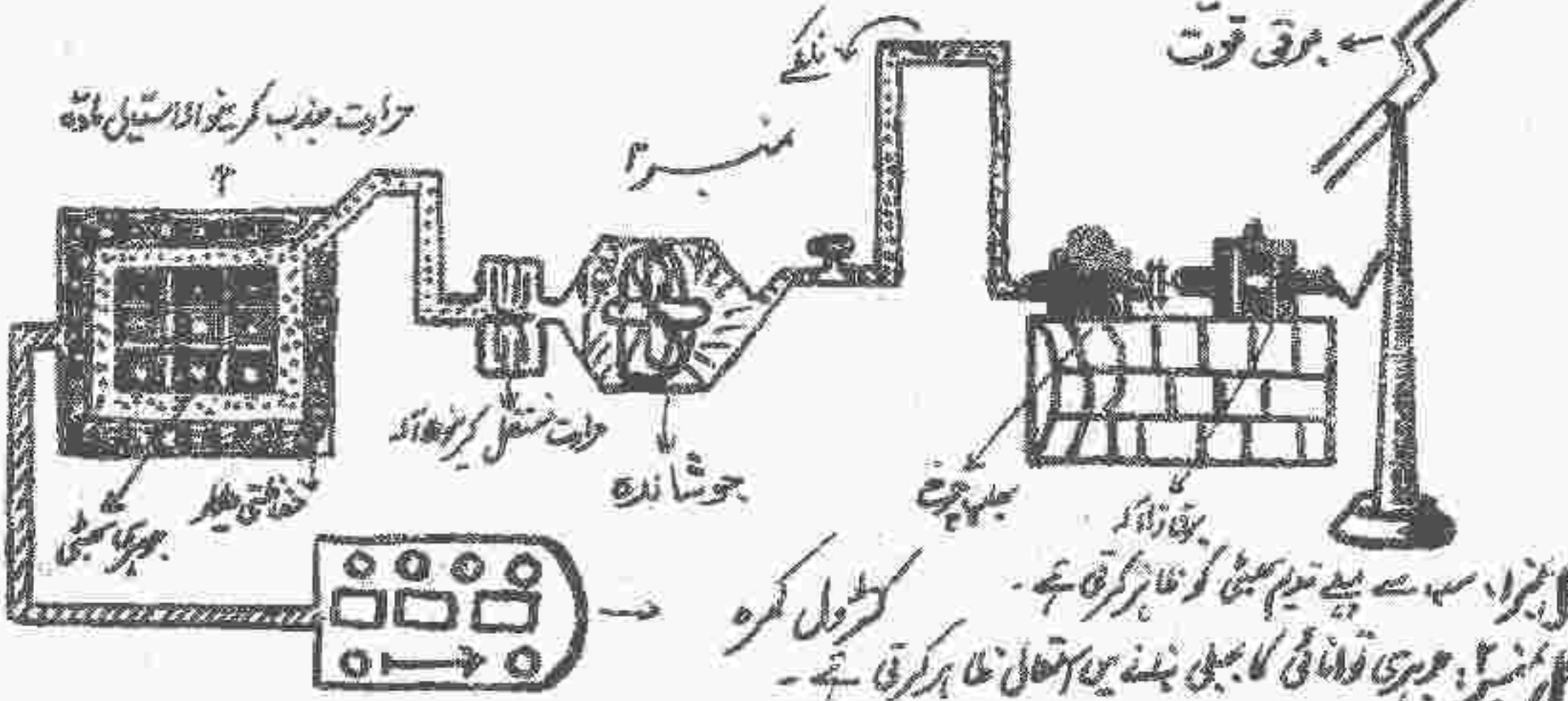

شکل نمبر ۱ سب سے پہلے قدیم بھٹی کو ظاہر کرتی ہے -
شکل نمبر ۲ جوہری توانائی کا بجلی بنانے میں استعمال ظاہر کرتی ہے -

یہاں تک غالباً جوہری توانائی کے متعلق کافی کچھ بنیادی حقائق واضح ہو گئے ہیں - لیجئے اب ہم

جوہری توانائی کے پُرامن استعمال پر غور کرتے ہیں

گزشتہ صفحات میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں - کہ اکثر ان جوہری بھٹیوں سے بجلی بنانے کا کام ہی نہیں لیا گیا - بلکہ تحقیقاتی اور تربیتی کام کے ساتھ ساتھ مصنوعی تابکاری بھی بنائے جا رہے ہیں - اس کے علاوہ

ایک عنصر دوسرے عنصر میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال یہ مصنوعی عنصری تبدیلی صرف یورینیم کو پلوٹونیم میں تبدیل کرنے میں استعمال کیا جا رہا ہے - اس طرح مصنوعی تابکاری بھی جو کہ صنعت ، زراعت

اور طب میں معجزانہ کام سر انجام دے رہی ہے بنائے جاتے ہیں۔ انجینئرنگ ورکس اور صنعت میں تابکاری شعاعوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ جس کے ذریعے ڈھلائی کے نقص، نلکیوں میں نقص، ویلڈنگ میں نقص اور دیگر اشیاء کی صحیح موٹائی کی جانچ پڑتال اور لوہے کو سیال صورت میں غیر ضروری اشیاء سے پاک کرنے کا کام لیا جا رہا ہے۔ تیل کی صفائی اور دیگر اشیاء کی صفائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

زراعت میں پودوں کی افزائش اور اناج کی بہتر اقسام معلوم کرنے کی کوشش، خوراک کو گلنے سڑنے سے محفوظ رکھنے کیلئے تابکاری شعاعوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ پودوں کی افزائش کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

ریاست ہائے متحدہ میں بیجوں کو تابکاری شعاع کی زد میں رکھ کر ایسی نئی تجرباتی اقسام دریافت کی گئی ہیں۔ کہ جس سے زیادہ غلہ حاصل ہوا اور ان کے پودے بیماریوں کے لئے مدافعت کی زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ اون اور پیٹ سن کی مقدار بڑھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ بیج کی نسلیات یا پودوں کی پرورش کے میدان میں جوہری توانائی نے نسبتاً تھوڑے ہی عرصہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سائنسدانوں نے بیجوں اور پودوں کے نئے پھوٹنے والے کلوں کو نیوٹرون ذرّوں کی زد میں رکھ کر یا جیم (۲) اشعاع کی زد میں رکھ کر بہتر اقسام تیار کر لی گئی ہیں۔ جئی کا اٹھارہ ماہ میں ان اشعاع کی زد میں رکھ کر ایک پودا تیار کیا گیا ہے کہ اس میں پھپھوندی نہیں لگتی مٹر کا ایسا پودا تیار کیا گیا ہے جس کو بیماری نہیں لگتی۔ اور تیس فیصدی پیداوار زیادہ ہوتی ہے اسی طرح گندم کی بھی نئی اقسام تیار کی گئی ہیں۔ اور چاولوں کی بھی نئی اقسام دریافت کر لی گئی ہیں۔ آلو کی بھی نئی قسم دریافت ہوئی ہے۔ جس کی غذائیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اور بیماری بھی نہیں لگتی۔ اور جلدی خراب نہیں ہوتا۔

آیئے، اب طب کے میدان میں جوہری توانائی کے استعمال پر نظر ڈالیں:۔

حیاتیاتی تحقیقات۔ امراض تشخیص اور علاج معالجہ بہت ہی مؤثر طریقوں پر انجام دیئے جا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم استعمال تابکاری ہمجاؤں کا ہے۔ جن سے نشان دہی کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے اور تابکاری اشعاع سے علاج بھی کیا جاتا ہے۔ گندھک کا ہمجا مریض کو دوائی کے ساتھ دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر اپنے سائنسی آلات کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ اسی طرح بعض بیماریوں کے بنیادی تصورات میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ مثلاً

۱۔ (مائیلوما) ایک قسم کا سرطان جس میں غیر معمولی نوعیت کے ورلیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ (ذیابیطس) جسم میں شکر کا مناسب طور پر جزو بدن نہ ہونا۔

۳- (انفرمیں)، جسم میں گلانی سیپن مادے کا غلط استعمال، اور حیاتیہ یعنی غذا کے جسم و بدن ہونے میں فرق پڑ جانا وغیرہ وغیرہ۔ رقیہ غذاؤں کے مطالعہ میں تابکار آئیوڈین استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر سرطان موجود ہے۔ تو تابکار مادہ اس عنصر میں زیادہ جذب ہوگا۔ جس کو گائیگر کاؤنٹر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح نشان دہی کر کے علاج آسان ہوگا۔ رسولی کا اشعاع کے ذریعے علاج میں تابکار کوبالٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ خونی سرطان میں تابکار فاسفورس استعمال کیا جاتا ہے۔ سٹرونشیم کا تیزاب پھوڑوں اور زخموں کے علاج میں بڑا مفید ہے۔ دماغ میں رسولی کا پتہ لگانا ہمیشہ دشوار امر تصور کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب فاسفورس نہیں جوہری وزن والا ہمجا کل جراحی میں بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ سونے کا ایک سو اٹھانوے (۱۹۸)

جوہری وزن والا ہمجا سینے، رحم اور پھیپھڑوں کے سرطان کے علاج میں مفید ثابت ہو چکا ہے۔ رگوں میں خون کے پورے دور کا بآسانی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دواؤں اور دوسرے طبی سامان کو جوہری اشعاع کے ذریعے جراثیم سے پاک کیا جاتا ہے۔ خواہ ذخیرہ کی صورت ہی میں کیوں نہ رکھی گئی ہوں۔ اسی طرح اب صحت عامہ کے محکموں، شفاخانوں، ڈاکٹروں کے دواخانوں، تجربہ گاہوں اور انسان کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے میں استعمال کی جا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ وہ وقت دور نہیں۔ جب چھوٹی چھوٹی جوہری بیٹریاں ہوں گی۔ اور ہماری موٹروں، کاروں، ریلوں اور دیگر مشینوں میں استعمال کی جائیں گی سمندر کی آبدوز کشتیوں اور تجارتی جہازوں میں پہلے ہی استعمال کی جا رہی ہیں۔

شاید بیرونی خلائی سفر میں بطور ایندھن اور بطور خوراک جوہری توانائی استعمال کی جائے اس طرح دوسرے ستاروں کا سفر آسان ہو جائیگا۔

سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں جنگی ہتھیاروں میں جوہری توانائی کا زیادہ استعمال نہ بڑھ جائے۔ اگر ایسا ہوا۔ تو انسانیت کا خاتمہ قریب ہے!

بقیہ الیکشن

(ص ۲۵)

اور بصیرت خود ہی دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ سالانہ مباحثوں کے ایام میں تو ان حضرات کے معدوں میں تبخیر کے ساتھ غلط فہمی کی شکایت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ——— جو پھر ڈنر کی بدہضمی سے ہی رفع ہوتی ہے۔!

میری خاک دل بھی آخر انہی کام آ ہی گئی
کچھ نہیں تو ان کو دامن ہی بچانا آ گیا (حفیظ)

لطف الرحمٰن مجید
بی ایس سی

الیکشن

(اپنے امیدوار بھائیوں سے معذرت کے ساتھ)

——— الیکشن کہاں نہیں ہوتے ہ بلکہ یہیں ممکن ہے۔ آپ نے کئی الیکشن دیکھے بھی ہوں گے کبھی۔ جوڑ توڑ۔ ہنگامہ دوڑ ——— نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ ان بڑے سیاسی الیکشنوں کو چھوڑیئے یہ کالج کے الیکشن کچھ کم ہیں۔! یونین ہے۔ سوسائٹیاں ——— اللہ کے فضل سے بہت کچھ ہے۔ ان سب میں سے یونین کا الیکشن بڑے دھڑلے سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض کالجوں میں اپنے موقعوں پر دھوم دھڑکے میں کمی یا زیادتی ہوتی ہو۔ مگر عام کیفیتیں بنیادی طور پر یکساں ہی رہتی ہیں

ہر چیز کا اپنا اپنا موسم ہوتا ہے۔ الیکشن کے بیج ستمبر، اکتوبر میں کالجوں میں "کاشت" کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ فرسٹ ایر وغیرہ مانسون ہواؤں کے آنے کا یہی "سیزن" ہوتا ہے۔ بادل گھر آتے ہیں۔ تو اہل میکدہ خم کے خم لنڈھاتے ہیں۔ یہاں جب یہ گھنگھور گھٹا آتی ہے۔ تو بہتوں کی "توبہ" ٹوٹتی ہے۔ فرسٹ ایر کا کالج میں آنا گویا چیونٹی کے گھر تیتر کا آنا ہے۔ پرانے یا نئے کالج نشینوں کے درشن کے لئے بڑے شوق سے آتے ہیں۔ خیرسگالی کے جذبات کا تبادلہ ہونے لگتا ہے۔ کچھ نہ کچھ دل لگی بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سارے پروگرام کو صوفی منش لوگ "چھیڑ خانی" سے ناحق یاد کرتے ہیں!

اللہ کی شان ہے کہ اسی عالم میں الیکشن کی افواہ پھیل جاتی ہے۔ اور پرانے پاپیوں کی توجہ یک دم اس نئے مشن کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اس راکٹ کے چھوٹتے ہی کالج کے کونوں کھدروں میں الیکشن کے موضوع پر بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔ نقارہ خلق نوٹس بورڈ کی اطلاع سے "سائرن" کی طرح گونجنے لگتا ہے۔ الیکشن کی بھنک کانوں میں پڑتے ہی یار لوگ لنگر لنگوٹ کس کر میدانِ عمل میں ٹپک پڑتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی امیدوار "ڈراؤنی کلیں" ہو کر سامنے موجود ہوتے ہیں۔ جن اصحاب کے سر پر الیکشن کا جن سوار ہوتا ہے ان کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ گھبراہٹ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی غیر آدمی دیکھ لے۔ تو یہی سمجھے کہ بیچاروں کو "فائر بریگیڈ" کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ دوڑ دھوپ کا ذکر ہی نہ کیجیے۔ ہر امیدوار

زبانِ حال سے کالج کی "سول سروس" سے متعلق یہی کہہ رہا ہوتا ہے :-

شوقِ بیجا نے "سول سروس" نے اس مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

صدقہ و خیرات مقاصد کے حصول میں مُمد و معاون ہوتا ہے۔ شاید اس لئے امیدوار نہایت فراخدلی سے اپنے "بجٹ" تیار کرتے ہیں۔ ان "صدقات" میں کافی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ اس راہ میں دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے بلکہ بعض مُخیّر حضرات تو رقوم پیشگی ہی جمع کرا دیتے ہیں۔ پھر نتیجے پر پتا لگتا ہے شیخ صاحب نے بکرے فراہم کئے ہیں۔ تو سید صاحب لڈو لا رہے ہیں۔ خان صاحب نے اگر بسکٹ رکھے تھے تو سید صاحب کیک اور پیسٹری سے کم کسی چیز پر اکتفا نہ کریں گے!!! غرض الیکشن کے طفیل ٹک شاپ اور دوسرے ریسٹورانوں کے دن پھرتے ہیں! ان دنوں حفظ ماتقدم کے طور پر حاتم طائی کی قبر پر پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان امیدواروں کی باتوں سے قبر کو شگاف پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

انتخابی مہمات میں مصروفیت کیوجہ سے امیدواروں کو کلاس میں جانے کی فرصت کہاں؟ مگر جب حُسنِ اتفاق سے سارے ووٹر کلاسوں میں چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بادلِ ناخواستہ لیکچر روم میں تشریف لاتے ہیں۔ مگر وہاں رقعہ بازی کے ذریعے "سلسلہ جنبانی" شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر بیچارے پروفیسر صاحب سر کھپا رہے ہیں ادھر اس مضمون کے رقعے مل رہے ہیں۔

"مائی ڈیئر جعفر!

.... آپ کے قیمتی ووٹ کا طالب

آپ کا اپنا

".........."

اور اس چیٹ کی پشت پر یہ "قیمتی ووٹ" درج ہوتا ہے

"پیریڈ کے مابعد آپ دوستوں کے ہمراہ ٹک شاپ میں تشریف لا کر مشکور فرمائیں۔ میں وہاں آپ کے انتظار کے لئے جا رہا ہوں.......

آپ کا اپنا

".........."

اس قسم کے "دعوت نامے" تقسیم کرنے کے بعد مسٹر "آپ کا اپنا" سر کھجاتے ہوئے کلاس سے کھسک جاتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے "مددگار کارکن" بھی اُٹھ اُٹھ کر ٹک شاپ کا رُخ کرتے ہیں۔۔۔ وہاں "گول میز کانفرنس" ہوتی ہے۔۔۔ اتنے میں شادی صاحب گھنٹی بجا دیتے ہیں۔۔۔ چنانچہ یہ نئی بھٹکی بلیاں بھی وہاں جا پہنچتی ہیں۔ اور پھر وہاں "معاہدے" ہوتے ہیں امیدواروں کی رقت کا یہ حال ہوتا ہے۔ کہ اگر ووٹ کے لئے انہیں دوڑ کر جانے سے نہلانا بھی پڑے تو اس کے لئے بھی تیار ہوتے ہیں!

یہ راز کی بات آپ تک پہنچاتا ہوں۔ کہ لاریوں کے حادثات سے بچنے کے لئے بہت سے ووٹر۔۔۔

—— Via Tuck Shop سفر کرتے ہیں ایجنٹ حضرات کے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں وہ لوگ جو ٹک شاپ میں ٹھنڈی چائے پینے کو ،، Great Honour ،، سمجھتے ہیں اور دستوں کی کتابیں کھنگالنے کے بعد نوٹس لگا کر اس ”ور آنر“ کو حاصل کرتے ہیں۔ ان دنوں میں کسی نہ کسی ”سیاسی پارٹی“ سے یا حسب توفیق تمام سیاسی پارٹیوں سے رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ کوئلوں کی دلالی میں شاید منہ کالا ہو جاتا ہے۔ مگر ووٹوں کی ایجنسی میں منہ میٹھا ہوتا ہے —— ”صاحبان! آزمائش شرط ہے!“

—— جوں جوں الیکشن قریب آتا جاتا ہے توں توں امیدواروں کی لجاجت، مروت اور مسکینی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بڑے بڑے پتھر دل موم ہو کر بہہ پڑتے ہیں۔ خوشامد کرتے ہیں۔ تو نوابوں اور راجے مہاراجوں کے ”گرینڈ“ درباری اور جی حضوری یاد آجاتے ہیں! انکساری کے ریکارڈ کے کئی ٹکڑے ہو جاتے ہیں!

ہماری کالج لائف کے چار پانچ دلکش سالوں میں ایسے کئی الیکشن ہوئے اور بڑے بڑے جغادریوں نے یہ الیکشن لڑے۔ ہم تو اللہ لوک آدمی ہیں۔ جی چاہا تو ووٹ دے دیا۔ ورنہ گھر بیٹھے ہی رہنے دیا۔ مگر اس کے باوجود ہر سال امیدوار بڑی لجاجت سے اس ووٹ کو بھی نکلنے کی کوشش کرتے، ہماری خاکستر میں یہ چنگاری نہ ہوتی۔ تو اچھا ہوتا۔ اس کمبخت نے ہمیں طرح طرح کے سنواتے ہیں!! بڑے بڑے القاب اور خطابات سے نوازے گئے ہیں۔ یہ ساری کرامات اس ووٹ کی ہی ہے! ورنہ ہم تو وہی ”کھوسٹ اور رنگروٹ“ ہیں۔ کبھی مرتبہ ہی سوچا ہے ع

”مجھ سے میرا ووٹ بہتر ہے جو اس کے دل میں ہے“

آئیے ایک امیدوار صاحب کا دیدار کیجئے! وہ آنجہانی راجہ اندر کا اکھاڑہ نہیں بلکہ امیدوار صاحب کی ”سواری“ کھڑی ہے! لیجئے وہ چل پڑے ”دولہا میاں“ بنے۔ شہ بالوں کے جھنڈ میں مٹک مٹک کر آرہے ہیں اور یہ ساتھی —— ”ادھر لو“ —— ”ادھر جو“ کر رہے ہیں! جہاں کوئی آدم زاد ملتا ہے امیدوار صاحب وہیں پڑاؤ فرماتے ہیں۔ سلام کے بعد کورنش بجا لاتے ہیں۔ مصافحے اور معانقے سے نوازتے ہیں ”ریڈی میڈ“ مسکراہٹ کے باوجود فکر اور تشویش سے چہرے کی بقول کرنل شفیق الرحمن ”بیرنگ لفافے کی طرح“ ہے! بلا مبالغہ ایسا لگتا ہے کہ آج ہی کالے پانی کی سزا سے فرصت پا کر انڈیمان سے واپسی ہوئی ہے —— یہی ساتھی ان کا تعارف کرواتے ہیں۔ خواہ آپ بچپن میں ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے رہے ہوں۔ تب بھی یہ چست گواہ —— سست مدعی صاحب کا تعارف کرا کے دم لیں گے! پھر آمد کا ”مقصد“ بیان ہوتا ہو خوشامد ہوتی ہے۔ ناواقفوں سے قدیم رشتہ داریاں یاد آجاتی ہیں۔ ناپید داروں کے مراسم کا انکشاف ہونے لگتا ہے —— ہائے اللہ ووٹ میں کتنی طاقت ہے ——!

یوں تو ان حضرات کے کئی مکالمے ہمیں یاد ہیں نسبتاً ایک تازہ ملاقات کا حال سُنیئے ——— ایک دو سال کی بات ہے۔ ایک امیدوار صاحب نے رات کے گیارہ بج کر ساڑھے پچپن منٹ پر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ غریب خانے پر آنا ضروری سمجھا! رات کیوقت اتنی فوج ظفر موج کیسی کانٹے سے لیس۔ اور امیدوار صاحب خود ڈبل ڈیکر (Double Decker) کے سائز کے تھے۔ پہلے تو ہم گھبرائے کہ یا الٰہی خیر۔ پولیس وارنٹ لے کر نہ آئی ہو۔ پھر تاڑ گئے کہ الیکشن کے دن ہیں۔ مبلغ ایک عدد ووٹ ہمارے کھوٹے پر بھی بندھا ہوا ہے۔ اس کی طبیعت پوچھنے آئے ہیں!

ذرا گفتگو کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو ——

ایک صاحب نے ڈبل ڈیکر صاحب کا تعارف کرواتے ہوئے کہا —— "یہ ہیں ..... صاحب آپ سے ملنے کے بڑے ہی مشتاق تھے!"

ہم نے پیش کر ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ گلے سے لگا لیا۔ گلے کیا لگایا —— ہمارا بھرکس نکال دیا —— ہمیں اس بے تکلفی سے سخت وحشت سی ہوئی۔ انہوں نے فرمایا —— "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" —— ہم تو پہلے ہی جل کر کوئلہ ہو چکے تھے —— جواب دیا "ہمیں تو سخت کوفت ہوئی ہے"

ان کے دوسرے ساتھی نے چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ انہیں جانتے ہیں نا؟"

میں نے جل بھن کر کہا —— "کیوں نہیں۔ میں تو انہیں پیدائش سے بھی پہلے کا جانتا ہوں!"

اس پر دُم دبا کر کھسکے ہوتے!

اچھا جی یہ تو فرمایئے۔ کہ اس وقت کیسے آنا ہوا؟ —— ہم نے غلطی کی۔ جو پوچھ لیا۔ اب سب چپ ہیں۔ ہم چپ بیٹھے ہیں کہ سب کا منہ تکتے رہے ہیں۔ آخر ایک صاحب نے سکوت توڑتے ہوئے کہا:۔

"یہ کھڑے ہو رہے ہیں نا!"

ہم نے جھٹ جیب سے عینک نکالی اور ان کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد عرض کیا —— "یہ کھڑے تو ہیں —— بیٹھے کب تھے"! اور ساتھ ہی دروازہ جھٹ سے کھول کر یہ چھٹک ماری —— "اگر کھڑا ہونے سے تکلیف ہوتی ہو تو آیئے بیٹھتے ہیں!"

بس پھر کچھ نہ پوچھیئے کہ کیا حال ہوا!

اس قسم کے ڈائیلاگ (Dialogue) آپ نے شاید ذرا کم سنے ہوں۔ بدقسمتی سے چار پانچ سالوں میں ہمیں بہت کچھ کہنا اور سننا پڑا ہے۔ امیدوار حضرات الیکشن کے دنوں میں تو اس قسم کی "رواداری" کو بڑے صبر و تحمل سے پی جاتے ہیں مگر کامیاب ہونے کے بعد "انتقام" لے لیتے ہیں! کامیابی کے بعد وہ مروت اور ملنساری گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتی ہے اور نہایت صفائی سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ ناکام اور (Disqualified) امیدواروں کو تو سانپ سونگھ جاتا ہے باقی عام ووٹروں کو یہ کامیاب امیدوار سونگھ جاتے ہیں۔ کامیابی کے ساتھ ہی "خودی" کا دورہ پڑتا ہے!

(بقیہ صفحہ ۴۱)

پروفیسر بشارت الرحمٰن
ایم اے

ایک دلچسپ مکالمہ

۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ جب کہ اخبارات میں تازہ تازہ یہ خبریں شائع ہوئی تھیں کہ شرپا ٹینزنگ اور سر ایڈمنڈ ہلیری نے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لیا ہے۔ یہ خاکسار رخصت گیا جہاں امریکہ شہر میں مقیم تھا۔ ایک دن وہاں کے ایک تعلیمی ادارہ کے اساتذہ سے ایک پارٹی کے موقعہ پر گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس گفتگو سے ہمارے طلبہ بھی علمی اور تربیتی لحاظ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں غیر مناسب نہ ہوگا۔

ایک پروفیسر صاحب نے خاکسار سے اس مجلس میں یہ سوال کیا۔ کہ آج کل کے اس دور میں آپ کو معلوم ہے۔ کہ علم میں ترقی کس برق رفتاری سے ہو رہی ہے۔ ایک ایک منٹ میں علم اتنی ترقی کر رہا ہے۔ جتنی گذشتہ زمانوں میں سالوں میں بھی نہ ہوتی تھی۔ قومیں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں سرتوڑ کوششیں کر رہی ہیں۔ آپ دیانت داری سے بتائیں۔ کہ ایسے زمانے میں دن رات میں چار پانچ گھنٹے نمازوں اور عبادات میں صرف کر دینا۔ کیا ہماری قوم کو ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے نہ کر دے گا؟ اسی طرح رمضان میں روزہ رکھ کر اپنی قوت عملیہ میں کمی پیدا کرنا۔ کیا اقوام کی باہمی مسابقت کے لحاظ سے خودکشی کے مترادف نہ ہوگا؟

یہ سوال خاکسار سے ایک پروفیسر اور علماء تعلیم یافتہ لوگوں کی بھری مجلس میں کیا گیا۔ میں نے ایک منٹ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مجھے اس مجلس میں ایسی بات کہنے کی توفیق دے جس کو یہ لوگ سمجھ جائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جو بات میرے دل میں ڈالی۔ اور میں نے ان کے سامنے پیش کی۔ وہ یہ تھی کہ میں نے ان سے ایک سوال کیا۔

میں نے کہا۔ کہ ماؤنٹ ایورسٹ چوٹی حال ہی میں سر ہوئی ہے۔ سالہا سال سے سینکڑوں لوگوں نے اس بارے میں کوششیں کیں۔ کتنی سال لگے۔ کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ لاکھوں روپیہ خرچ ہوئے۔ تب جا کر ہوا یہ کہ ایک چوٹی سر ہو گئی۔ اور انسان کے علم میں بھی کچھ اضافہ ہو گیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ

اس ایٹمی دور میں صرف چوٹی کو سر کرنے کیلئے اتنا مال اور اتنا وقت صرف کرنا جائز ہے؟

انہوں نے جواب دیا۔ کہ ہاں بالکل جائز ہے ان لوگوں نے ایک غیر مفتوحہ چوٹی پر چڑھ کر ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اور یہ کام انسان کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا ایک شاہکار ہے۔

اس پر میں نے کہا۔ کہ کیا دنیا میں اس سے بھی کوئی بلند تر چوٹی ہو۔ اور ایسی چوٹی ہو۔ کہ اُسے سر کرکے انسان کی کایا ہی پلٹ جاتی ہو۔ علوم کے چشمے وہاں سے جاری ہوتے ہوں۔ تو کیا اُسے سر کر لینا مفید نہ ہوگا؟ ہاں ایسی چوٹی کو اگر بنی نوع انسان سر کر لیں تو دنیا میں پائیدار امن قائم ہو جائے۔ تمام انسان بھائی بھائی بن جائیں۔ ایک عالمگیر اخوت کی لڑی میں پروئے جائیں۔

وہ کہنے لگے۔ کہ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟ ایسی کون سی چوٹی ہے؟

اس پر میں نے کہا کہ اس چوٹی کا نام اللہ تعالیٰ ہے جس کی بلندی سے ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرکے جو علوم انسان کو ملتے ہیں ان کا اُن علوم سے مقابلہ کرنا جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرکے انسان کو حاصل ہوئے ہیں، دیوانگی ہے۔

اگر بنی نوع انسان اپنے اس العلی العظیم خالق و مالک سے تعلق پیدا کرلیں۔ اور اس کی آسمانی بادشاہت کو اپنے اوپر قبول کرلیں۔ تو سب ایک باپ کے بیٹوں کی طرح ہو جائیں گے۔

اسلام نے جو نمازیں۔ روزے۔ دیگر عبادات مقرر کی ہیں وہ دراصل اسی چوٹی کو سر کرنے کے لئے ہیں۔ اگر نماز، روزہ، دیگر عبادات کے ذریعہ انسان کا زندہ خدا سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ تو کیا اس ایٹمی زمانے میں یہ کوئی مہنگا سودا ہے؟ آپ مجھ سے یہ سوال تو بجا طور پر کرسکتے ہیں کہ ایک زندہ حی و قیوم خدا کے موجود ہونے کی کیا دلیل ہے؟ یا اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ عبادات کے ذریعہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے؟ لیکن اگر اللہ تعالیٰ موجود ہے۔ اور اگر عبادات کے ذریعہ ہم اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ تو پھر یہ سوال معقول نہیں ہے۔ کہ اس ایٹمی زمانے میں ہم اپنے اوقات اس کام کیلئے کیوں خرچ کریں

پھر میں نے انہیں بتایا کہ خدا تعالیٰ کی معرفت و تعلق کے بغیر انسان علوم میں ترقی کر رہا ہے۔ مگر یہی ترقی اس کے لئے ایک عذاب بن گئی ہے۔ اس ترقی کی بدولت ہی دنیا اس وقت تباہی کے گڑھے پر کھڑی ہے روس اور امریکہ میں صرف ایک بٹن دبانے سے دنیا آن کی آن میں جل کر راکھ ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی بتا دیا تھا کہ زمین و آسمان کے رازوں کو دریافت کرنے والے دنیا میں ایک آگ کا عذاب قائم کردیں گے۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے تعلق کے ساتھ علوم میں ترقی کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے ذہنوں کو ایسے رخ پر پھیر دیتا۔ کہ علوم کی ترقی انسان کو تباہی کی طرف نہ لیجاتی

ہر چیز کی کلید اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔
اسی لئے ایک مسلمان سائنسدان کو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی ہے۔ کہ تم جب سائنس میں ترقی کرو۔ تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتے جاؤ۔ کہ اے خدا! ہماری اس سائنس کے نتیجے میں آگ کا عذاب نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ - رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ۝

خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین و آسمان کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ جب وہ ان کے رازوں کو دریافت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھ کر ایمان میں اور بھی ترقی کرتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ایسا نہ ہو کہ ہمارے علوم ہمارے لئے عذاب نار کا موجب بن جائیں تو ہمیں اس آگ سے محفوظ رکھیو۔

چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنے وقت میں علوم و فنون میں ترقی کی اور انہیں چار چاند لگائے مگر ان کے علوم کے ذریعہ انسانیت کو فائدہ پہنچا۔ اور وہ بابرکت ہی ثابت ہوئے۔

پس نماز پڑھنا۔ روزہ رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا کوئی بے فائدہ امر نہیں۔ بلکہ یہی وہ امر ہے۔ جس پر انسان کی انفرادی اور قومی بلکہ عالمگیر نجات کا جسمانی و روحانی طور پر مدار ہے۔
ہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ عبادت کا مفہوم وسیع تر ہے۔ نماز۔ روزہ و دیگر شرعی ظاہری عبادات کے علاوہ در اصل اس میں اللہ تعالےٰ کی صفات میں رنگین ہونے اور اس کے ہر قسم کے احکام کی کامل فرمانبرداری شامل ہے۔

دنیا ان امور سے غافل ہے وہ اپنی پیدائش کے مقصد سے ہی دور جا رہی ہے مسلمان کہلانے والے تعلیم یافتہ لوگ مجالس میں یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ انہی غفلتوں کے نتیجہ میں دنیا تباہی کے منہ میں جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بیدار اور چوکس کرنے کے لئے ایک ڈرانے والا بھیجا مگر افسوس۔ صد افسوس۔ دنیا نے اس کی آواز پر بھی کان نہ دھرا۔:

"دنیا میں ایک نذیر آیا۔ پر دنیا نے اُسے قبول نہ کیا لیکن خدا اُسے قبول کریگا اور بڑے زور آور حملوں سے اُس کی سچائی ظاہر کر دے گا۔"

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

عطاء المجیب راشد
بی اے ۔ سال اول

زوال کیوں؟

"تاریخ عالم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمانہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ جو قوم آج برسرِ اقتدار ہے کل کو وہی قوم محکوم ہو جاتی ہے اور کبھی مظلوم اقوام برسرِ اقتدار آ جاتی ہیں ابتدائے آفرینش سے آج تک ہزارہا اقوام بامِ عروج کو پہنچیں انہوں نے کمال کا انتہائی مرتبہ حاصل کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ کے لئے اس بلند مرتبے پر قائم نہ رہ سکی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ان پر زوال آ گیا۔ اور آج ان کا ذکر محض تاریخ کا ایک باب بن کر رہ گیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قوموں پر زوال کیوں آیا؟ ان کی سطوت و عظمت خاک میں کیوں رل گئی؟ ان کی شان و شوکت کیوں جاتی رہی؟ اور ان کا ذکر کیوں فراموش کر دیا گیا ہے؟ ایک وقت وہ تھا کہ جب آریہ لوگ حکمران تھے۔ پھر یونانی تہذیب کا طلوع ہوا۔ ان کے بعد اہل روما برسرِ اقتدار آئے اور جب ان کا دور بھی گزر گیا۔ تو اسلامی تہذیب نے دنیا کو صلح و آشتی کا پیغام دیا۔ اور دنیا ایک تاریک دور سے نکل کر منور دور میں داخل ہو گئی۔

جب ایک مورخ اقوام عالم کے عروج و زوال کی داستانوں کا بنظرِ غائر جائزہ لیتا ہے۔ تو اُسے سب سے زیادہ افسوس مسلمانوں کے زوال پر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر قوم کا زوال ہی قابلِ افسوس ہے۔ لیکن مسلمان وہ قوم تھی۔ کہ جس کو دیگر اقوام عالم پر ایک خاص برتری حاصل تھی۔ اس برتری کی وجہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے جن حالات میں ترقی کی وہ کسی اور قوم کو پیش نہیں آئے۔

مسلمانوں کی غربت، کمزوری اور کس مپرسی کی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں مسلمانوں کو اعلانیہ طور پر خدائے واحد کی عبادت کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ فقر اور تنگدستی کا یہ عالم تھا۔ کہ کئی کئی روز تک صحابہ کے گھروں میں آگ روشن نہ ہوتی تھی۔ بے سرو سامانی کا یہ نقشہ تھا کہ کھجور کی شاخوں کی جھونپڑیاں ہیں جن میں صحابہ رہتے ہیں۔ گرمی میں دھوپ کی شدت تکلیف دہ ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے۔ تو جھونپڑی سے پانی ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ غرض ان نامساعد حالات میں سے گزرنے والے صحابہ کرام نے اپنی قربانیوں اور جانفشانیوں کی وجہ سے اعلیٰ مرتبہ پایا۔

دوسری طرف جب مسلمانوں کو عظمت حاصل

ہوئی۔ تو یہی فاقہ مست اور پیٹ پر پتھر باندھنے والے مسلمان صحابہ بڑے بڑے طاقتوں کے حاکم بن گئے۔ وہ مسلمان جن کی آنکھیں سلاطین کے جاہ و جلال کی وجہ سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ آج بڑے وقار اور عزت کے ساتھ خود ان عالم بادشاہوں کی جگہ جلوہ افروز تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ایک قابلِ رشک اور بے مثال زمانہ تھا۔ آرینی، یونانی اور رومی حکومتیں بھی کچھ کم نہ تھیں بلکہ اپنے عہد کی ممتاز ترین اقوام میں سے تھیں۔ لیکن ان کے مقابل پر مسلمانوں کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ ان کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ اور سلاطین تھرا جاتے تھے۔ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی سکت نہ تھی۔ مسلمانوں کے عزائم کے سامنے دریا اور سمندر سمٹ کر رہ جاتے تھے۔ اور ان کی قوت ارادی سے پہاڑ لرز جاتے تھے۔ غرض مسکینی اور غربت کی حالت میں پروان چڑھنے والے یہ صحابہ اپنے عروج کے زمانہ میں اختیار و اقتدار کی بلند ترین حیثیت کے مالک تھے۔ اور دنیا کی تمام طاقتیں ان کی فولادی قوت اور آہنی عزائم کا لوہا ماننے لگیں۔ اور اسلامی پرچم فضا کی بلندیوں میں لہرانے لگا۔

جب تک مسلمانوں میں جوش اور ولولہ موجود رہا۔ وہ آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ جب ان کے جانشینوں نے اپنے اسلاف کے سنہری کارناموں کو فراموش کر دیا۔ تو رفتہ رفتہ ان کی یہ شان و شوکت کم اور یہ رعب و دبدبہ زائل ہونا شروع ہو گیا۔ وہ مسلمان صحابہ جو اسلام کی خاطر اپنی جانوں پر کھیل جایا کرتے تھے۔ جو رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار تھے۔ اب ان مسلمانوں کی اولادیں اپنے فرائض منصبی کو فراموش کر چکی تھیں۔ وہ اسلام کے استحکام کے لئے متحد ہونے کی بجائے ذاتی نوعیت کے مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا۔ تو مسلمانوں کو اس کی قبل از وقت اطلاع مل گئی۔ لیکن انہوں نے کوئی حفاظتی اقدام نہ کیا تھا کہ فوج شہر کے دروازہ پر آ پہنچی۔ اس نازک وقت میں مسلمانوں کی حالت یہ تھی۔ کہ دشمن کی فوج سر پر کھڑی ہے۔ اور مسلمان علماء اس بات پر لڑ رہے ہیں۔ کہ آیا الو حرام ہے یا حلال؟ ——— غور کیجئے کہ مسلمانوں کی اولادوں نے کس طرح اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو فراموش کر دیا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آسمان کے ستاروں کو چھونے والے اور آکاش کی رفعتوں کو پامال کرنے والے یہ مسلمان خود اپنے اعمال کی وجہ سے قعر ذلت کی عمیق گہرائیوں میں جا پڑے۔

مسلمانوں کے تنزل کی یہ داستان اسلامی تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے لیکن بہرحال حقیقت ایک حقیقت ہے۔ مسلمانوں کا یہ زوال

کسی ایک وجہ بات سے ہوا۔ جس کا ثبوت تاریخ سے ملتا ہے۔ ان میں سے بعض سیاسی وجوہ ہیں۔ اور بعض اقتصادی۔ لیکن اس زوال کی بنیادی وجہ یہ تھی۔ کہ مسلمانوں میں پہلے جیسا احساس ذمہ داری مفقود ہو چکا تھا۔ وہ اس بات کو بھول چکے تھے کہ ان کے فرائض کیا ہیں؟ اور ان کے آباؤ اجداد کا عالی منصب ان سے کن امور کی سرانجام دہی کا تقاضا کرتا ہے؟

تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو قوم بھی اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتی وہ قانون قدرت کے تحت ایک دن ضرور سرنگوں ہو جاتی ہے۔ قدرت کا قانون یہ نہیں کہ جو قوم بھی ترقی کرے وہ ایک نہ ایک دن ضرور زوال پذیر ہوگی۔ لیکن چونکہ یہ ایک فطری کمزوری ہے کہ انسان اپنے فرائض منصبی کو بھول جاتا ہے۔ اور قدرت کا اٹل قانون اس غلطی کو معاف نہیں کرتا۔ اسلیئے وہ قوم تنزل کی جانب بڑھنے لگتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ جب کسی قوم کے افراد میں احساس ذمہ داری مفقود ہو جائے۔ اور فرائض منصبی کا شعور ختم ہو جائے۔ تو پھر وہ قوم ہرگز ترقی نہیں کر سکتی۔ اور بہت ممکن ہے کہ تنزل و تخریب کی تیز و تند ہوائیں اس کی ترقی کو روک کر انحطاط میں بدل دیں۔ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جب ایک فرد میں احساس ذمہ داری نہیں رہتا۔ تو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ آپ نے لا تعداد بار اس بات کا تجربہ کیا ہوگا۔ کہ جب ایک طالب علم یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کا فرض محنت اور کوشش سے علم حاصل کرنا ہے اور وہ ایسا ہی کرتا ہے تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ اور جب اور جس وقت یہ جذبہ اور احساس بھلا دیا جاتا ہے۔ تو ترقی کا خیال امید موہوم سے بدل جاتا ہے۔ بالکل اسی طریق پر قوموں کی ترقی اور عروج اور زوال و انحطاط کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مختلف افراد کے مجموعہ کا نام ہی قوم ہے۔

اس بات کا قطعی ثبوت کہ واقعی احساس ذمہ داری کسی قوم یا افراد کے روشن مستقبل کی ضمانت ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی مثالوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے کہ جنہوں نے اس جوہر کی وجہ سے نام پیدا کیا۔ جب مسلمانوں پر زوال مسلط ہو چکا تو اس وقت ان کے اخلاقی زوال کی حالت اس حالت کی عکاسی کرتی تھی۔ کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کے لوگوں کی تھی۔ چنانچہ مولانا حالی مرحوم نے اس حالت کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

لیکن اس تاریک دور میں بھی خدا کے کچھ نیک بندے مخلوقِ خدا کی اس بے راہ روی پر گداز دل کیساتھ

خدا سے دعائیں کرتے تھے۔ اور بندگانِ خدا کی بہتری چاہتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کو ملّتِ مسلمہ کی اس حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ گمراہی اور بے دینی بہت ذلت کا باعث ہے۔ چنانچہ ایسی احساس ذمہ داری سے معمور ہو کر ان میں سے ہر ایک نے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور اسی نیک جذبہ کی وجہ سے ان کا نام آج بھی عزت سے لیا جاتا ہے ان بزرگوں میں سے مثال کے طور پر حضرت معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ اور حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ کے اسمائے گرامی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

الغرض! یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ احساسِ ذمہ داری خواہ وہ کسی قوم میں پیدا ہو یا کسی فرد میں۔ بہرحال ترقی عطا کرتا ہے۔ احساسِ ذمہ داری کے بعد ترقی کے لئے قوتِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن در اصل یہ قوت بھی حقیقی احساسِ ذمہ داری کے نتیجہ میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیں بھی سوچنا چاہیئے کہ ہمارا ضمیر اور نصب العین ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں بحیثیت ایک طالب علم کے ہمارا اولین فرض یہی ہے۔ کہ ہم زیادہ ذمہ داری سے پڑھیں اور پڑھائی کا حقیقی حق ادا کریں۔ پڑھائی کا حقیقی حق کیا ہے؟ یہ آپ کا ضمیر آپ کو مجھ سے زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا ہے۔ سوچیں اور بار بار سوچیں اور کمرِ ہمت باندھ کر مصروفِ عمل ہو جائیں۔

ارشد ترمذی

غزل

آں بہارے کہ سرِ روضۂ رضواں دیدم
عکسِ آں ہم بہ سرِ کوچۂ جاناں دیدم

عاقلاں ہیچ ز غم زیست کنند آہ و فغاں
اہلِ ہاں را بہ جہاں شاداں و فرحاں دیدم

ہیچ فرقِ روح ز غم و سہر ندیدم آزاد
من ہمہ دنیائے دوں صورتِ زنداں دیدم

ایں ہمہ سیم تناں و نظرم ہیچ نشد
آں رخِ یار را یکبارہ چوں خنداں دیدم

منتشر گشت ہمہ فکر و خیالِ ارشد
چوں بہ سیمائے تو آں زلفِ پریشاں دیدم

لعل خان : سال دوم

کوہساروں کے دامن میں

چودہ جون کی دوپہر باوجود انتہائی تمازت اور جھلسنے والی لو کے ہمارے لئے بہت ہی خوشگوار ثابت ہوئی۔ جب ہم نے پانچ دن کے مایوس کن انتظار کے بعد یہ نوید جانفزا سنی۔ کہ حضرت میاں صاحب نے کالج کے ریسٹ ہاؤس کی تعمیر کے سلسلہ میں ہمیں بھی کاغان جانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے دلفریب وادی کے حسین نظاروں کے تصور میں چلچلاتی دھوپ میں ہم نے جلدی جلدی تیاری مکمل کرلی۔ محترم چوہدری صاحب نے بہت اصرار سے کہا کہ اطمینان سے تیاری کرکے بڑے آرام سے کل چلے جانا۔ مگر ہمارے دل بلیوں اچھل رہے تھے۔ ایک دن کا مزید انتظار ہم سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو ہمیں یہ بھی فکر تھی۔ کہ کہیں پہلے کی طرح پروگرام پھر ایک دو دن کے لئے ملتوی نہ ہو جائے۔ بڑی مشکل سے۔ بچوں کی سی اصرار کے بعد چوہدری صاحب سے اجازت لی۔ جناب ایکسپریس چھ بجے شام چھوٹتی تھی ہم پانچ بجے ہی سٹیشن پر پہنچ گئے۔ شاید ہماری زندگیوں کا وہ ایک بہت ہی عزیز لمحہ تھا۔ جب ہم گاڑی پر سوار ہو گئے۔ اور ہمیں یقین ہو گیا۔ کہ روح فرسا انتظار کے آخری لمحات شمع سحری بن چکے ہیں

محترم عبدالشکور صاحب اسلم کی معیت میں ہم چھ طلباء وادیٔ کاغان کی سیر کو روانہ ہوئے۔ جو اس سال چند مجبوریوں یا کسی مصلحت کی بنا پر ہائیکنگ سوسائٹی اور بیالوجی سوسائٹی اکٹھی ہی بھیجی جا رہی تھیں۔ چھ طلباء کی اس ٹیم میں امتیاز الدین سال سوم۔ عبدالحفیظ سال دوم۔ نصیر احمد سال دوم۔ منیر الحق رانا۔ مقبول احمد سال دوم اور راقم شامل تھے۔ اول الذکر دو موخر الذکر نے ہائیکنگ سوسائٹی کی طرف سے اور باقی طلباء نے بیالوجی سوسائٹی کی طرف سے شمولیت کی۔ بیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ ڈیمانسٹریٹر محمد شریف صاحب نے باورچی کے طور پر شرکت کی

چناب صبح کے آٹھ بجے ٹیکسلا پہنچی۔ ہمیں ٹیکسلا کے کھنڈرات اور عجائب گھر دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ سرکپ کے کھنڈرات نزدیک ترین تھے۔ تعمیرات کی مہارت اور صفائی سے تراشے ہوئے پتھروں کی سیدھی دیواریں۔ کھلے بازار اور دوسری بے شمار چیزیں ان کے مہذب اور متمدن ہونے پر روشنی ڈالتی تھیں۔ میوزیم جا کر تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی کہ سینکڑوں سال قبل کے لوگ

بھی کتنے ذہین اور عقلمند تھے۔

ٹیکسلا سے بذریعہ ریل حویلیاں پہنچ کر ہم لاری میں ایبٹ آباد کے راستے مانسہرہ روانہ ہو گئے۔ ایبٹ آباد حویلیاں سے چھ میل آگے تقریباً چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک بہت ہی خوبصورت اور صحت افزا مقام ہے۔ اس حسین شہر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہم آگے گزر گئے۔

مانسہرہ میں ایک گھنٹہ قیام کے بعد پروگرام یہ بنا کہ وہاں سے گیارہ میل آگے ایک گاؤں بیوگلہ کے قریب سڑک کے کنارے اپنے کالج کی زمین پر خیمہ زن ہوں گے۔ شام ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ہم وہاں پہنچ گئے۔ جلدی جلدی خیمہ نصب کیا اور کھانا پکانے کی سوچنے لگے۔ ابھی اس پروگرام کے ابتدائی مراحل بھی طے نہ ہو چکے تھے کہ شام ہو گئی

اس اجنبی ڈیرے میں اندھیرا اتنا ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا۔ کہ ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کی تھرتھراتی زرد روشنی سے نظریں ہٹا کر باہر دیکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔ یکایک ایک تند و تیز آندھی چلنے لگی۔ جنگل کے ہر طرف پھیلے ہوئے اونچے لمبے درختوں کے سوئی نما پتے اتنا خوفناک شور مچا رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہمارا خیمہ ہر تھپیڑے سے جھک جھک کر ہر لمحہ ہمارے لئے ایک نئی مصیبت پیدا کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں خیمے میں بیٹھنے سے باہر لیٹ جانا زیادہ محفوظ معلوم ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں لقمان شاہ صاحب اپنے بھائی کے ساتھ آ گئے

انہوں نے بتایا کہ ذخیرہ دو فرلانگ کے فاصلہ پر فوجی خچروں کا ایک اصطبل خالی ہے۔ فیصلہ ہوا کہ اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ پسوؤں والے غلیظ بدبودار اصطبل میں ہم نے وہ رات کیسے بسر کی یا وہ سالن ہم نے کیسے کھایا جس میں دال میں زیادہ نمک گر گیا تھا۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ کم از کم ہم اس وقت اللہ تعالیٰ کے بہت شکر گزار ہوئے جس نے کمال مہربانی سے ہمیں طوفانی رات کی مصیبتوں سے بچا لیا تھا۔

صبح سویرے ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں جاگنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں ابھی آنکھیں بند کئے کمبل ہی ٹھیک کر رہا تھا۔ کہ باہر سے انچارج صاحب کی آواز آئی۔ "اٹھو بھئی۔ نماز کا وقت جا رہا ہے" ناچار اٹھنا ہی پڑا۔ نماز سے فراغت کے بعد گزشتہ رات کے واقعات پر تبصرہ شروع ہوا تو پتہ چلا کہ پسوؤں کو امتیاز الدین صاحب سے کوئی خاص انس رہا ہے۔ وہ ہر ایک کو سرخ سرخ ابھری ہوئی پھنسیاں دکھا رہے تھے۔ ان کی تسلی خاطر کی غرض سے کھٹمل بھی فہرست میں شامل کر لی گئی۔

ناشتہ کے بعد رات والی جگہ سے ذرا ہٹ کر خیمہ نصب کیا گیا۔ اس دن جمعہ تھا۔ امتیاز الدین صاحب نے نماز پڑھائی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سہ پہر کو سیر کے لئے جائیں۔ مشرقی سمت شمالاً جنوباً پھیلا ہوا سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ جنگل کے دیوقامت درخت

ہر طرف پھیلے ہوئے تھے جیسے اس دور افتادہ ویران علاقہ کی حفاظت کر رہے ہوں۔ لیکن کوئی بھی تو تنہا نہ ہوتا تھا۔ معلوم نہیں انہیں خیمہ میں لیٹے لیٹے کونسا مزہ آتا تھا۔ مجبوراً اکیلا ہی گھومتا رہا۔ چیل کے درختوں کے نیچے چلغوزے گرے ہوئے تھے گن و بیروزہ اکٹھا کرنے کے بے شمار برتن درختوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک مقامی باشندہ سے ملاقات ہوئی۔ تو اس نے بڑی دلچسپ باتیں بتائیں اس نے بتایا۔ کہ یہ برتن دو تین دن میں بھر جاتے ہیں۔ اور مزدور اگر انہیں خالی کر کے گندہ بیروزہ لے جاتے ہیں۔ گندہ بیروزہ سے وارنش، تارپین کول تار اور چند ایک دیگر ادویات بنتی ہیں۔

شام تک شکیل صاحب جو مانسہرہ گئے تھے واپس تشریف نہ لائے۔ تو ہمیں فکر ہونے لگی۔ بار بار خیال آتا تھا کہ اگر یہ رات بھی گذشتہ رات کی طرح ثابت ہوئی یا موسم خراب ہو گیا۔ تو کیا کریں گے خیمہ کے رسوں کو اور مضبوطی سے باندھ کر ہم بمصداق

"بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"

سو گئے۔ ہوا بہت تیز نہ تھی۔ دوسرے ہم چیل کھیتوں کی اور سائیں سائیں، کے شور سے بھی کافی حد تک مانوس ہو چکے تھے۔ گردونواح کا علاقہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اجنبیت کچھ کم محسوس ہوتی تھی۔ اس طرح دوسری رات آرام سے گذر گئی۔

دس بجے ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب نے سیر کا پروگرام بنایا۔ اونچی پہاڑیاں ہمیں دعوت عمل دے رہی تھیں۔ ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی یہ چڑھائی کافی مشکل تھی۔ ڈرتے ڈرتے، احتیاط سے پیر جماتے ہم گھنٹہ بھر میں چوٹی پر پہنچے۔ تو مشرق کی پہاڑیوں کی چوٹیوں کے پیچھے ایک لال رنگ کا خوبصورت بنگلہ نظر آ رہا تھا۔ نعمان صاحب نے بتایا کہ یہ نہ یہی جنگلات کا ریسٹ ہاؤس ہے اور بڑی خوبصورت جگہ پر واقع ہے۔ سب کا خیال تھا کہ ضرور جانا چاہیئے لیکن راستہ کے بارے میں اختلاف ہوا۔ ہر طرف گھنا جنگل تھا۔ اور چڑھائی انتہائی حد تک خطرناک تھی۔ اترتے وقت بھی ہم چھ چھ فٹ اونچے پتھروں پر سے لیٹ لیٹ ٹانگیں لٹکا کر اترتے رہے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد ہم پھر نیچے اترنے لگے۔ دس منٹ کی اترائی کے بعد ہم ایک تنگ سی وادی میں پہنچے جو پہاڑیوں کے اوپر سے بہنے والے چھوٹے چھوٹے نالوں سے بنی تھی۔ قریب ہی ہمیں پانی کے چشمے مل گئے۔ اب ہمیں سمت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اس لئے سورج سے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ ریسٹ ہاؤس پہنچنا اب ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اب ایک صورت یہی نظر آ رہی تھی کہ وادی کے ساتھ ساتھ آگے چلتے جائیں۔ اور ممکن ہے کہیں سے آسان راستہ کا پتہ چل سکے۔ وادی کے تقریباً تین میل سفر کے بعد بھی ہمیں ناامیدی ہوئی۔ تاہم ہم نے سفر جاری رکھا۔ دو بجے کے قریب ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں یہ وادی ایک بڑے نالے کے راستہ پر ختم ہو جاتی تھی۔ پاس ہی ایک مکان تھا جس میں مستری ...

خوبانیوں کے درخت دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک بوڑھی عورت نے ہمیں بلایا۔ اور ایک خط پڑھنے کے لئے کہا۔ یہ بڑی مہمان نواز ثابت ہوئی۔ اس نے خوبانیاں ہم کو کھانے کیواسطے دیں۔ ایسی میٹھی خوبانیاں ہم نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھیں۔ وہیں پر ہمیں پتہ چلا کہ ہم اپنے کیمپ سے پانچ میل دور آ چکے ہیں۔ ہمیں یہ مشورہ دیا گیا کہ نیچے نالہ کے ساتھ چلتے جائیں۔ تو تین میل کے بعد سڑک پر پہنچ جائیں گے اور پھر وہاں سے سڑک راستہ واپس آ سکیں گے۔

تین میل کے اس نئے سفر میں ہم نے بہت سے چشمے، آبشار اور پن چکیاں دیکھیں۔ بالآخر جب سڑک پر پہنچے۔ تو گڑھی حبیب اللہ صرف ایک میل کے فاصلہ پر مشرق کی طرف نظر آ رہی تھی۔ دریائے کنہار کے کنارے یہ چھوٹا سا قصبہ ہمیں بڑا عجیب معلوم ہوا۔ قریب ہی دیا سلائی کا کارخانہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے کارخانہ کی جی بھر کر سیر کی۔ اور پانچ بجے کے قریب واپس چھنگلہ روانہ ہوئے۔ جو گڑھی سے سات میل دور ہے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہم منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔ راستہ میں انار کے درخت بڑی کثرت سے اگے ہوئے تھے مگر ابھی پھل کچا تھا

آفتاب مشرق سے دن کے سفر کے بعد تھکا ماندہ مغرب میں رات بھر آرام کرنے جا رہا تھا۔ پرندے واپس گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ اب ہمارا کیمپ صرف ایک میل دور تھا لیکن قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ کاش یہ سفر سات میل کی بجائے چھ میل ہوتا اور اس وقت تک ہم کیمپ پہنچ چکے ہوتے۔ اندھیرا بڑی تیزی سے سارے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک بھی تو ختم ہو چکی تھی۔ اور ابھی ہمارا کیمپ پورے آٹھ فرلانگ یعنی سترہ سو ساٹھ گز دور تھا۔ اگر ہم ایک قدم میں دو فٹ فاصلہ طے کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ابھی دو ہزار چھ سو چالیس قدم اور چلنا پڑے گا۔ اُف وہ!

انہیں خیالات میں تھے ہم آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ ہمیں دور سے دو آدمی اپنی طرف آتے دکھائی دیئے کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ شکور صاحب اور نصیر احمد آ رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور پہلی بار احساس ہوا۔ کہ ہم نے بغیر اجازت کیمپ کو کیوں چھوڑا۔ ہم دل ہی دل میں شکور صاحب کی متوقع ناراضگی پر پریشان ہو رہے تھے۔ لیکن جب ہم آمنے سامنے ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ خفا ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ ہم صحیح سلامت تھے۔

اب ہم پھر سے تازہ دم ہو گئے اور کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ شکور صاحب نے باتوں باتوں میں بتایا کہ کس طرح سنگ بنیاد کی تقریب ہماری غیر حاضری میں عمل میں لائی گئی۔ اور کس طرح ہماری غیر حاضری کو محسوس کیا گیا تھا۔ راستے ہی میں شکور صاحب اور نصیر کے مانسہرہ سے جلد واپس نہ آنے کی وجہ معلوم ہوئی۔ ہوا یوں کہ چھنگلہ سے مانسہرہ جاتے ہوئے انہوں نے چند امور کے سلسلے میں سیدھا

ایبٹ آباد کا پروگرام بنا لیا - وہاں انہوں نے مکرم منظور احمد صاحب ایم - ایس - سی پروفیسر گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے مل کر ([illegible]) کے حصول کے لئے کچھ معلومات حاصل کرنا تھیں -

دوسرے دن صبح انہوں نے ایبٹ آباد سے چند اشیاء خریدیں - اور واپس مانسہرہ پہنچے - اسی دن شام کو کالج کے لئے بنگلہ کے قریب سے خریدی ہوئی زمین پر کالج کے ریسٹ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھنا تھا - انہوں نے مانسہرہ سے مٹھائی وغیرہ اور دیگر اشیاء خریدیں - اور شام کی پارٹی کے لئے انتظامات جلدی جلدی مکمل کرلئے - چار بجے کے قریب مانسہرہ سے مدعو احباب تشریف لائے - بنگلہ گاؤں سے بہت سے غیر از جماعت احباب بھی مدعو تھے - اس طرح اس تقریب میں کم و بیش پچاس مہمانوں نے شرکت کی -

مانسہرہ سے محترم پیر زمان شاہ صاحب ایڈووکیٹ محترم جمال صاحب معلم وقفِ جدید محترم عبدالرشید صاحب انبالوی محترم عبدالشکور صاحب غنی اور بنگلہ سے لقمان شاہ صاحب کے والد محترم اور انکے خاندان کے بعض افراد خاص مہمانوں میں سے تھے

محترم پیر زمان شاہ صاحب نے چار بجکر بیس منٹ پر سنگِ بنیاد کی رسم ادا کی اور دعا فرمائی - اس موقعہ پر تصاویر بھی لی گئیں اس کے بعد طلباء نے مہمانوں کی تواضع کی تقریب کے اختتام سے کچھ پہلے لقمان شاہ صاحب کی درخواست پر انکے علاقے کے ایک صوبیدار صاحب جو ایک با اثر شخصیت ہیں بھی تشریف لائے اور بہت خوشی سے اس تقریب میں حصہ لیا

(بقیہ صفحہ ۔۔)

یہ روح کی آزادی کا انقلاب ہے - یہ ظلم و ستم کے خاتمہ کا انقلاب ہے یہ جاگیرداری کے خاتمہ کا انقلاب ہے "

رحمو جاگیرداری کے نام پر چونکا اور جلدی سے بولا "کیا پھر ہمارے گاؤں کے ظالم جاگیردار کی جاگیرداری بھی ختم ہو جائے گی ؟ " "یقیناً یقیناً" - بوڑھے نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا - اور ہجوم میں گم ہو گیا - رحمو کا من خوشی سے جھوم اٹھا - وہ نئی امنگوں کے ساتھ اپنے گاؤں کو چل دیا - چلتے چلتے راستہ میں اس کو شام پڑ گئی - مگر وہ آگے نئے ولولے اور جوش سے بڑھتا گیا - آسمان پر بادلوں کے ننھے منے ٹکڑوں نے مٹرگشت شروع کر دی - آہستہ آہستہ بادلوں کے ٹکڑوں نے مل کر کالے بادلوں کا روپ دھارنا شروع کیا - چاند ستارے گم ہونے شروع ہو گئے - بارش شروع ہو گئی - ہر چیز پر اندھیرے کا غلاف چڑھ گیا مگر رحمو آگے بڑھتا گیا - گاؤں کے نزدیک اس نے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنی - آواز ہر دم اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی - اس نے اپنے آپ کو جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا لیا - دوسرے لمحہ ایک سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا سوار کو گراتے ہوئے رحمو کے قریب سے گزر گیا وہ جلدی سے سوار کی طرف بھاگا - وہی ظالم جاگیردار زمین پر پڑا آخری دم لے رہا تھا - بارش تھم چکی تھی - پو پھٹ رہی تھی اور ایک نئی صبح رحمو کو ایک نئی مسرت کا پیغام سنا رہی تھی -

مرسلہ

چوہدری رشید احمد جاوید
سیکنڈ ایر (ڈگری)

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ

برکھا رُت تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ پورب کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خراماں خراماں آرہی تھی بڑے میاں نماز سے فارغ ہو کر چارپائی کی طرف بڑھے حقہ کا ایک کش لگایا پھر نوید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"بیٹا نوید! کل تم نے خواہش کی تھی کہ میں تمہیں کوئی دلچسپ، حقیقت افروز اور سبق آموز کہانی سناؤں۔ جنوں، پریوں اور بادشاہوں کی کہانیاں تو تم سنتے ہی رہتے ہو۔ یہ کہانیاں دلچسپ اور بعض حالات میں سبق آموز تو ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن انہیں حقیقت افروز نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ کہانیاں بالعموم "زائیدہ از تخیل" کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ جو کہانی آج میں تمہیں سنانے لگا ہوں وہ نہ تو جدید افسانہ نگاری کی عکاسی کرتی ہے۔ کہ جس کی آماجگاہ "انسانی تخیل" ہیں۔ اور نہ ہی یہ الف لیلےٰ کا کوئی فرضی قصہ ہے۔ کہ جس سے انسان کے عجیب الخلقت ہونے پر گمان ہو۔ یہ ایک کہانی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک عجیب واقعہ سے ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ یہ غلو اور مبالغہ کی آمیزش سے پاک ہے۔"

اس تمہید کے بعد بڑے میاں نے حقہ کا ایک اور کش لگایا، ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پھر یوں گویا ہوئے "نوید اگر تم "تلازم خیال" کے قائل ہو کیونکہ تم نفسیات کے ایک سنجیدہ طالب علم ہو۔ آج میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔ کیونکہ آج جو واقعہ میں تمہیں سنانے لگا ہوں وہ بھی "تلازم خیال" کا ہی نتیجہ ہے

ہاں..... تو کہانی سنو "جاڑے دن کا ساون" تھا۔ مغرب سے کچھ ہی پہلے بارش تھم چکی تھی مغربی افق کے قریب کہیں کہیں نیلگوں آسمان نظر آتا تھا۔ سورج اس وقت بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ سردیوں کی بارش کے "لطیف پن" سے تو سب ہی واقف ہیں۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا۔ جلدی جلدی بھینسوں کو دوہا۔ پھر مال مویشی مکان کے اندر باندھے اسی دوران میں موذن کی "حَيَّ عَلَى الصَّلوٰة" کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچ گئی۔ سردی اس بلا کی تھی کہ دانت "بجا" رہے تھے۔ مگر جوانی کا عالم تھا۔ گھر پہ نماز پڑھنے کو بزدلی خیال کیا۔ چنانچہ وضو بجوش سے مسجد کی راہ لی۔ مسجد کے دروازے کے قریب ہی میں نے دیکھا۔ کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا اور ان کے ساتھ ایک

سفید ریش بزرگ ــــ غالباً دلہن کا سسر ــــ کھڑے تھے ۔ چہرے مہرے سے پہچان گیا ۔ کہ کوئی مسافر ہیں ۔ تمام کپڑے بھیگے ہوئے ، جسم تھر تھر کانپ رہے تھے ، ہونٹ نیلے ہوتے جا رہے تھے ۔ شام پڑ چکی تھی اور اندھیری رات سامنے تھی ۔ گرچہ جگ دور حیرت کی فراوانی اُس کے علاوہ بھی ۔ مجسم فریاد بنے ہوئے تھے ۔ مگر تھے خاموش ۔ ! شاید خدا ان کے ذریعہ اپنے بندوں کی شکر گزاری کا امتحان لینا چاہتا تھا ــــ خیر نماز ختم ہوئی ۔ نمازی ایک ایک کر کے جانے لگے ۔ میرا خیال تھا ۔ کہ گاؤں کے چوہدریوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ان کی خبر یا داد رسی کرے گا ۔ چوہدری قمر الدین عام نمازیوں کے برخلاف تسبیح ذرا تسلّی سے کیا کرتے تھے ۔ چونکہ گاؤں کے سب سے مالدار آدمی تھے اور آج بھی انہوں نے سب سے پیچھے تھا ۔ اس لئے میں یہ خیال کر کے کہ وہ تو ضرور ان کو اپنے ساتھ لے جائیں گے مطمئن ہو کر گھر کو ہو لیا ۔ ابھی کوئی آدھا رستہ آیا ہوں گا کہ دل میں ایک شدید ولولہ اٹھا ۔ انہیں پاؤں مسجد کی طرف لوٹا ۔ میں نے دیکھا ۔ کہ چوہدری قمر الدین بھی مسجد سے جا چکے تھے ۔ مگر وہ تینوں انگشت بدنداں کھڑے تھے مگر ان کی حالت پہلے سے بھی زیادہ قابلِ رحم نظر آ رہی تھی ۔ بڑے میاں سے مخاطب ہوتے ہوئے میں نے پوچھا ــــ " بابا جی ! آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانے کا خیال ہے ؟ کیا کسی چوہدری نے آپ سے روٹی کپڑے کا پوچھا بھی ہے یا نہیں ؟ بڑے میاں نے پہلے میرے سوال کے آخری حصّے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ابھی تک تو نہیں ــــ پھر کہنے لگے ــــ ہمیں ساتھ لے

جا رہے تھے گاڑی پر سوار ہونا تھا ۔ وہ شکے کے قریب ہم دو کلاس دور سے روانہ ہوئے تھے ۔ ابھی نصف فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ بارش نے گھیر لیا ۔ اب یہ حالت ہے کہ گاڑی تو جا چکی ہے ۔ اسٹیشن وہ میل دور ہے واپس جانے کا بھی خیال نہیں ۔ کیونکہ صبح پہلی گاڑی پکڑنے کا ارادہ ہے ۔ سنا تھا کہ آنکھم پور کے چوہدری بڑے مہمان نواز ہیں ۔ اس لئے رات گزارنے کے خیال سے یہاں آ گئے ۔ واقف ہمارا کوئی ہے نہیں ۔ جب بڑے میاں اپنے الفاظ ختم کر چکے تو میں نے ان سے کہا " بابا جی ! آئیے ! ! میرے ساتھ چلیں ۔ آج رات آپ میرے مہمان ہوں گے " ۔ تینوں میرے ساتھ ہو لئے ۔ گلی کا چکر کاٹ کر ہم گھر پہنچ گئے ۔ موسم کی خرابی کے باعث میں نے اس دن کچھ پکایا بھی نہ تھا ۔ بس دودھ پر ہی اکتفا کر لی تھی ۔ آٹے والا برتن جو دیکھا ۔ تو آٹا ختم تھا ۔ میری مالی حالت تو کوئی ایسی تھی نہیں کہ کوئی اور چیز ہی رکھی ہوتی ۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا ۔ کہ مجھے خیال آیا کہ ایک پوٹلی میں باقی کے کچھ چاول پڑے ہوئے ہیں ۔ جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا ۔ تو ان کے گیلے کپڑوں پر نظر پڑی ۔ میرے کچھ کپڑے صندوق میں پڑے ہوئے تھے ۔ اُسے کھول کر میں نے وہ کپڑے نکالے ۔ اور انہیں پیش کر دیئے کہ آپ گیلے کپڑے اتار کر خشک کپڑے پہن لیں ۔ ان کے ساتھ جو عورت تھی ۔ اس نے بھی میرے ہی مردانہ کپڑے پہن کر گزارا کیا ۔ ان کے گیلے کپڑوں کو لٹکا دیا تاکہ صبح تک سوکھ جائیں ۔ اب میں نے اس بہن سے کہا کہ لو بہن ! یہ ہیں کلٹھہ بابا اور یہ ہیں چولہے کے لئے انگیٹھی ؟ وہ وہ

چاول اور گڑ حاضر ہے۔ بھوک تو آپ کو لگی ہی ہوگی ان کی "کھیر" پکائیں۔ پہلے تو ان سب نے انکار کر دیا۔ کہ کھانے وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں مگر میرے مسلسل اصرار پر اس بہن نے کھیر تیار کر دی۔ انہوں نے بھی کھائی اور ہم نے بھی۔ پھر میں نے بستر نکالے۔ ان کو لگایا جگہ گو تنگ تھی۔ مگر مطلوبہ گنجائش نکل آئی۔ بہرحال رات اچھی گذر گئی۔ صبح ہوئی۔ تو بڑے میاں نے جانے کی اجازت چاہی۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ کہ ایک غریب نے ان کی خدمت کے لئے کتنی کوشش کی ہے۔ میری آنکھیں بھی نم تھیں۔ کہ خدا کے فضل سے کس طرح نیکی کا ایک موقع بہم پہنچایا۔ الغرض وہ مجھ سے رخصت ہو گئے مگر ان کے پرخلوص جذبات اب بھی میرے سامنے ہیں دن گذرتے گئے۔ یہ واقعہ پرانا ہوتا گیا۔ میری شادی ہوئی۔ کئی بچوں کا باپ بنا۔ ان میں سے دو لڑکے ہیں بڑے کا نام صادق اور چھوٹے کا نام طالب ہے دس سال گذرے۔ ان کی والدہ فوت ہو گئی تھی۔ صادق اور اس کی بہنوں کی شادیاں تو وہ اپنی زندگی میں ہی کر گئی تھی۔ طالب چھوٹا تھا۔ اس لئے میرے ساتھ رہنے لگا۔ زمینداری کا کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتا۔ اور اس طرح ہماری گذر اچھی بری ہوتی رہی۔ بڑھاپے کے فطری تقاضے کے باعث میں کام کاج میں کچھ کم حصہ لینے لگا۔ ادھر طالب کام چور نکلا۔ وہ دن بھر کبھی کسی کے گنے چوری کرتا۔ کبھی کوئی سبزی توڑ لاتا۔ مجھے اس کی یہ روش پسند نہ آئی۔ میں نے اسے ہر چند اس کام سے منع کیا۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ قصہ کوتاہ وہ گاؤں کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی پارٹی میں شامل ہو کر برے کاموں میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر قریب کے ایک گاؤں میں ڈاکہ ڈالا۔ ڈکیتی تو وہ ناکام رہی۔ مگر پولیس کے پرچہ میں نام سرفہرست تھا۔ اب وہ مفرور تھا۔ پولیس مجھے تنگ کرتی۔ کہ پیش کرو۔ مگر میں اس عمر میں اسے کہاں ڈھونڈتا۔ کہاں کہاں اس کے پیچھے مارا مارا پھرتا۔ تنگ آکر پولیس سے جان چھڑانے کے لئے بڑے لڑکے صادق کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ سندھ میں پڈعیدن کے قریب ایک گوٹھ میں اپنے بہنوئی کے ہاں مقیم تھا چنانچہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اگلے ہی دن کراچی ایکسپریس کے ذریعہ پڈعیدن روانہ ہو گیا۔ جب گاڑی روہڑی پہنچی۔ تو مجھے شدید بخار ہو چکا تھا۔ اسی حالت میں پڈعیدن پہنچا۔ بخار اور پھر سفر میں۔ میری حالت بڑی نازک ہو چکی تھی۔ ایک تانگے والے کو روپیہ دیا۔ وہ مجھے صادق کے پاس چھوڑ گیا۔ صادق کو سب ماجرا سنایا۔ اس نے میرے ساتھ ہمدردی کی۔ اگلے روز بخار اگرچہ ہلکا ہو چکا تھا۔ مگر نقاہت بہت زیادہ تھی۔ تمام دن بستر پر گذارا۔ رات ہوئی تو اسی شدت سے بخار ہوا۔ کہ ہوش و حواس نے جواب دے دیا۔ پھر یہ بخار مسلسل پندرہ روز رہا۔ پندرہ روز کے بعد بخار ٹوٹا تو ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ میرے تمام جسم پر پھنسیاں نکل آئیں۔ صادق نے میرے علاج کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر میں نے تنگ آکر پردیسی کا ارادہ کیا۔

اس دفعہ میں جناب ایکسپریس پر سوار ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اپنی منجھلی بیٹی کو ملتا جاؤں۔ وہ ان دنوں لائلپور کے قریب ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ جناب ایکسپریس کو لائلپور پورے پانچ بجے پہنچنا تھا۔ مگر رستہ میں وہ گھنٹے لیٹ ہو گئی۔ لائلپور پہنچی۔ تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ بسوں وغیرہ کے اوقات بھی ختم ہو چکے تھے۔ سفر کی تکان کے باعث میرا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ مغرب بھی ہو چکا تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ ناچار ایک مسجد کی راہ لی۔ گرتے پڑتے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر ایک صف پر لیٹ گیا۔ بھوک، بیماری اور تکان کی نذر ہو گئی۔ بس لیٹتے ہی نیند غالب آ گئی۔ جس پہلو پہ سویا تھا اسی پہلو پہ بیدار ہوا۔ سوتے وقت میری جیب میں تیرہ روپے تھے مگر وہ بھی کسی "حاجتمند" کے ہاتھ کی صفائی کی نذر ہو گئے۔ قدرت کی اس ستم ظریفی پہ میں سخت متعجب اور پریشان ہو رہا تھا۔ مگر ضمیر اجازت نہ دیتا تھا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ اسی خیال میں میں نے شہر سے باہر ایک بستی کی راہ لی۔ مگر جب شہر سے باہر نکل چکا۔ تو پھنسیوں کے درد سے بار بار میری آہیں نکل جاتیں۔ شہر سے کوئی اڑھائی فرلانگ کے فاصلہ پر ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس بیکسی، غریب الوطنی اور بے سروسامانی کی حالت میں مجھے ایک دفعہ پھر اونگھ آ گئی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے پاؤں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ دبا رہا ہے۔ میں نے آنکھ کھولی۔ دیکھا کہ میرے قریب ہی ایک معمر عورت بیٹھی ہوئی ہے اس کے پاس برتن دیکھ کر میں نے خیال کیا کہ وہ باہر کھیت میں اپنے خاوند کو روٹی کھلا کر آئی ہے۔ شاید میری دردناک حالت کو دیکھ کر اسکے دل میں رحم آ گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ میں نے انکار کیا۔ مگر وہ برابر اصرار کرتی گئی کہ آپ ضرور چلیں۔ آپکو جانا پڑیگا۔ آخر میں رضامند ہو گیا۔ کوئی دو فرلانگ کا فاصلہ طے ہوا کہ اس عورت کا گھر آ گیا۔ اپنی بہو کو آواز دی کہ جلدی جلدی پلنگ بچھا دو۔ اسنے حکم کی تعمیل کی۔ وہ عورت مجھے سہارا دیکر اندر لے گئی اور پلنگ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے لیٹ جانے کو کہا۔ میں اپنے میلے کچیلے کپڑوں کیساتھ پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ وہ ایک بڑی سی بالٹی میں نیم میں ابلا ہوا پانی لیکر آ گئی۔ پھر ہمدردانہ لہجہ میں کہنے لگی!!! اپنی ٹانگیں ذرا چارپائی سے نیچے لٹکائیں۔ میں نے اپنی ٹانگیں نیچے کر دیں۔ اس نے میری ٹانگیں دھونی شروع کیں۔ چونکہ پھنسیوں کے باعث میری ٹانگوں میں کافی سوجن ہو گئی تھی اسلئے جوں جوں وہ نیکدل عورت میری ٹانگیں دھوتی جاتی میرے ہوش و حواس واپس آتے گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے مجھے کپڑوں کا ایک جوڑا لا کر دیا۔ اور مجھے کہا کہ نیم کا پانی تیار ہے غسل فرما لیں۔ کپڑے اتار کر مجھے دیدیں تاکہ میں انہیں دھو دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ غسل کے بعد وہ میرے لئے کھانا لے آئی۔ یہ سب خاطر مدارات اور شفقت و محبت کا مظاہرہ دیکھ کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے اس سے پوچھا؟

"بہن! جو سلوک آپ نے آج میرے ساتھ کیا ہے ایسا تو حقیقی بیٹیں بھی نہیں کرتیں۔ (بقیہ صفحہ ۱۲۴ پر)

تحریر: شمیم اعجاز انجم سیکنڈ ایئر بی اے

اُدب کی اہمیت

ادب کی اہمیت موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دیگر ایسے فنون سے بہت زیادہ ہے کیونکہ ادب کی اثر انگیزی متنوع کی حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب اپنے تنوع کے اعتبار سے لامحدود ہے کیونکہ ادب ذہن کے ہر پہلو کی تصویر کشی اور انسانی فطرت کے ہر رُخ کو اجاگر کرتا ہے۔ غنائی شاعری کی صورت میں ہو تو ہمیں زندگی کے حسن سے لطف اندوز کراتا ہے حِس اور ادراک پر شعر کا اثر مسلمہ ہے آئی اے رچرڈ نے ادراک کی تہذیب انسانی میں نظم کو منظر عجب بات یہ نثر پر مقدم ہے یعنی جب کوئی یاس انگیز نغمہ چھیڑتا ہے تو سامعین بلا اختیارانہ داد و تحسین سے چیخ اٹھتے ہیں۔ اور شاعر جب طربیہ و نشاط کا گیت الاپتا ہے تو سننے والے خوش و شادماں ہو جاتے ہیں۔ ڈراما المیے کی صورت میں ہو تو زندگی کی بدصورتی پستی کی جھلکیاں دکھا کر ہمیں آدمی سے انسان بناتا ہے۔ طربیے سے ہم ہنستے ہنستے قہقہے لگانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ادب طنز و مزاح کا روپ دھار لے تو ہمیں اپنی حماقتوں اور نادانیوں پر ہنسنا آتا ہے۔ تخیلی ادب یا رومانی کے مطالعے سے ہمارے اندر ان خواہش کے حصول کی شدید تمنا پیدا ہوتی ہے۔

ادب عالیہ کے مطالعہ سے جو کیتھارسس پیدا ہوتی ہے اور جو مسرت ہم حاصل کرتے ہیں اس کی نوعیت کے بارہ میں بے شمار نظریات ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جنہیں آئے دن رنج و الم سے واسطہ پڑا رہتا ہے بڑے المیوں مثلاً میکبتھ یا ہیملٹ سے کیوں لطف اندوز ہوتے ہیں؟ ان المیوں میں رنج و غم بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے۔ اور اس کے کردار اپنی بدبختیوں، محرومیوں اور کوتاہیوں کو شرح و بسط سے بیان کرتے ہیں۔ المیے میں پیش کردہ زندگی سے جب ان کو دکھ پہنچتا ہے۔ تو وہ ملی جلی تقریریں کر کے خود کو تسکین دے لیتے ہیں۔ وہ ہر کسی کو داستان غم سناتے پھرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ کس طرح ہر شخص ان کی مخالفت اور بدقسمتی پر تُلا ہوا ہے۔ مثلاً ہیملٹ ہمیشہ شکوہ سنج اور بپھرا اور جلا ہوا نظر آتا ہے ——— ہم ان المیوں کی تحسین و تعریف کرتے ہیں۔ کیوں؟ ارسطو کا کہنا ہے کہ ہم سٹیج پر المیوں کو دیکھ کر اس لئے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے جذبات کی زیادہ اور ناگوار شدت کو دھیما کر دیتے ہیں۔ خصوصاً رحم اور خوف کے جذبات کو جو مسلسل ہمارے اندر کھولتے رہتے ہیں، اگر باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔ تو وہ ہمارے اندر ہی اندر اینٹھتے رہتے ہیں۔

ہم گھٹتے اور کڑھتے ہیں۔ اور یہ جذبات ہمیں عصبی المزاج چڑچڑا اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ بزعم ارسطو المیہ کسی ہولناک واقعے کی چوٹ سے ہمارے جذبات کو تسکین بخشتا ہے۔ کیونکہ ڈرامانویس اپنی فطری ذہانت اور ماہرانہ چابکدستی سے اس میں ایسے ڈھب سے رنگ بھرتا ہے۔ کہ ہمیں وقتی طور پر بالکل حقیقی اور اصلی محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح المیہ جذبات کی وافر شدت کو کم کرکے ہماری نفسیاتی صحت کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہمارے اندر زندگی بسر کرنے کی نئی امنگیں، نئی آرزوئیں اور نئی جولانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

محولہ بالا نقطۂ نظر کے مطابق ادب گویا زندگی سے فرار کا راستہ ہے مگر غالب خیال یہ ہے کہ ادب عالیہ زندگی سے فرار کا راستہ نہیں۔ بلکہ زندگی کی وسعت اور رفعت کا ضامن ہے۔ جہاں تک وسعت کا تعلق ہے ادب عالیہ کی مدد سے ہم زندگی کو گویا تقدیس و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یوں زندگی ہمیں پہلے سے زیادہ دلچسپ اور جینے کے قابل معلوم ہونے لگتی ہے۔ جہاں تک رفعت کا تعلق ہے ادب عالیہ کے مطالعے سے ہم ایک ایسی خوبصورت، دلکش، مسحورکن اور دلفریب دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جس کا عام زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ادب ہمیں زندگی کے نئے نئے امکانات کا پتہ دیتا اور قابل بناتا ہے۔ کہ ہم دنیا میں زیادہ گہرا بھی زیادہ جوش و خروش اور زیادہ حسن دیکھنے لگتے ہیں۔

ہم اپنے جذبۂ ہمدردی کی وسعت اور تخیل کی پرواز کے لئے زیادہ گنجائش دیکھتے ہیں۔

طالسطائی اپنے ناول "جنگ و امن" میں ایسی ناقابل فراموش فکر کی گہرائی اور ایسی باریک بینی سے سپاہیانہ زندگی اور اس کی پوری جزئیات کی تصویرکشی کرتا ہے۔ کہ آپ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ تمام تجربات جو جنگ کے دوران میں ایک سپاہی کا مقدر ہوتے ہیں۔ گویا آپ کی ذات پر بیتے ہیں۔ آپ کا دل اس کی آرزوؤں اور تمناؤں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جرأت بہادری کے سب۔ ان میں آپ اس کے شریک بن جاتے ہیں۔ تکلیف اور وحشت کے بھرپور وار آپ کے سینے پر بھی لگتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم قدرت کی نیرنگیوں کا بغور جائزہ نہیں لیتے۔ مگر ورڈزورتھ کی نظموں کو پڑھنے سے وہ ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ ہمیں کھلی فضا، درختوں، پھولوں اور پرندوں سے گہری دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم حسب بساط سرور و انبساط حاصل کرتے ہیں۔ تھامس ہارڈی صرف یہی بتانے پر اکتفا نہیں کرتا کہ قدرت اپنے گوناگوں اور متنوع کاموں میں مشغول ہے۔ بلکہ وہ خوش آئند پیرائے میں قدرت کے کاموں کا فرداً فرداً تذکرہ کرتا ہے۔ اس قسم کی تحریریں ہماری آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ تاکہ ہم قدرت کا مشاہدہ کرکے اس کا گوشہ گوشہ چھانتے ہوئے اس کے خزانوں

میں سے بہت کچھ بلکہ سب کچھ دیکھیں۔

ادب کی سب سے زیادہ قابلِ ادراک اور اہم اثرات میں سے ایک اس کی حیرت انگیزی ہے وہ طاقت ہے جو ہمارے تجسس اور تحیر کو بیدار کرتی ہے۔ پریوں اور جنوں کے قصے عموماً اس فقرے سے شروع ہوتے ہیں:۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے ....." یا کسی لرزہ خیز کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

"شام کا وقت تھا، دھند چھا رہی تھی، سورج ڈھل چکا تھا ......"

اگر کہانی اچھی ہے تو آپ عالمِ خیال میں مسرور دنیا و مافیہا کے جھمیلوں سے دور بڑے انہماک سے کتاب کے آخر تک پہنچنے تک پڑھتے چلے جائیں گے محض اس لئے کہ آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ آگے کیا ہوا۔ کہانی میں پلاٹ کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اور پلاٹ کی عمدگی پر ہی داستان گوئی کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ پلاٹ کے بعد کردار میں ان کے جذبات ایک دوسرے کے لئے اور ان جذبات کا ردِعمل ایک دوسرے پر جس انداز سے ہوتا ہے۔ ناول نگار اسے اپنی تخلیق میں نقش کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں لوگوں کے تعلقات چھوٹی چھوٹی بے شمار باتوں کے باعث کشیدہ یا منقطع ہو جاتے ہیں۔ لیکن ناول میں آپ لوگوں کے تعلقات تمام چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ خلوص میں رچے ہوئے پائیں گے۔ آپ کو ایک پوری دنیا اپنے سامنے موجود نظر آتی ہے۔

آخر میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ادبِ عالیہ میں ایک جادو بھرا ہوا ہوتا ہے۔ جو ہمارے دلوں کو اپنے اسرار حلقے میں مسحور کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:۔

س

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ

(بقیہ صفحہ ۱۹)

میں آپ کے اس ہمدردانہ سلوک کا بے حد شکر گزار تھا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر میں اس سلوک پر حیران ہوں!" جب میں اپنی بات ختم کر چکا۔ تو اس نے کہا "بھائی! تو مجھے بھول گیا ہے۔ مگر میں تجھے نہیں بھولی۔ تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود مجھے تو سردیوں کی وہ بارش والی رات اب بھی کل کا واقعہ معلوم ہوتی ہے۔

جب کہ آپ نے ہمارے اجنبی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا۔ جس کی امید ہمارا دوست ایک سگے بھائی سے بھی نہیں ہو سکتی!" یہ کہانی نوید کی خواہش کے مطابق نہ صرف عجیب اور حقیقت افروز تھی۔ بلکہ سبق آموز بھی ......!!

عطاء الرحمٰن پرویز
سال چہارم (سائنس)

نئی صبح

(افسانہ)

آج امیر خان جاگیردار کے ڈیرے پر خوب رنگیلی محفل جمی ہوئی تھی - ہر طرف قہقہے اٹھ رہے تھے۔ نشہ سے سرشار امیر خان اچانک چلایا - "او ننھو! وہ خبیث کمینہ رحمو کا بچہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ جاؤ اس گستاخ کو گھسیٹ کر میرے پاس لے آؤ۔"

"حضور وہ دیکھو رحمو آ گیا۔" ننھو نے چونک کر جواب دیا۔ امیر خان غصہ سے چلایا

"رحمو! مجھے زمین کا ٹھیکہ ابھی تک کیوں نہیں ملا جب کہ فصل کبھی کی کٹ چکی ہے۔"

رحمو امیر خان کے چڑھے ہوئے تیور اور نشیلی آنکھیں دیکھ کر سہم گیا - اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا

"حضور اس سال بارش کی کمی سے فصل اچھی نہیں ہوئی - اور ساتھ ہی میرے کچھ مویشی بیماری سے مر گئے ہیں۔ ٹھیکہ اگلے سال ...."

"میں اگلے سال کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتا مجھے ٹھیکہ وقت پر ملنا چاہیئے تھا۔" امیر خان گرجا۔

"کیا تم میرے انتقام اور غصہ کو بھول گئے ہو؟"

رحمو انتقام کا لفظ سن کر سہم گیا - اس پر کپکپی طاری ہو گئی - وہ جانتا تھا کہ جاگیردار کا انتقام تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا - رحمو نے بہت منتیں کیں - کہ وہ ٹھیکہ اگلے سال لے لے - مگر امیر خان کا غصہ ہر آن بڑھتا جا رہا تھا - کہ اچانک کسی خیال سے اس نے خوفناک قہقہہ لگایا - اور بولا

"جاؤ تمہیں کل تک مہلت دیتا ہوں۔"

رحمو حسرت و یاس کی تصویر بنے واپس لوٹ آیا - وہ بہت الجھن میں تھا - وہ کسی صورت میں کل ٹھیکہ ادا نہیں کر سکتا تھا - جب اس کو جاگیردار کا غضب آلود چہرہ اور انتقام کے الفاظ یاد آ جاتے تو وہ کانپ جاتا۔

سورج اپنا طویل سفر ختم کر کے رات کی گود میں میٹھی نیند سو چکا تھا - ہر طرف اندھیرے کی حکومت تھی - گاؤں کے لوگ سردیوں کی طویل رات میں کبھی کے میٹھی نیند سو چکے تھے - مگر ایک رحمو ہی ایسا تھا جس سے نیند روٹھ چکی تھی - وہ بستر پر دراز بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدل رہا تھا - اس کے دماغ میں جاگیردار کے الفاظ ہر گھڑی چکر لگا رہے تھے - جب کبھی سرد ہوا کا شریر جھونکا اس کے دروازہ کو ہلاتا - تو وہ سہم جاتا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا - وہ سمجھتا - جیسے کسی نے اس کے دروازہ پر دستک دی ہے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھتا شاید

کہیں جاگیردار موت کا فرشتہ بن کر نہیں آ گیا۔ وہ انہی تصورات سے خوفزدہ تھا کہ اچانک اس نے چند نقاب پوشوں کو دیوار پھاند کر مکان کے اندر آتے دیکھا۔ رحمو ایک دم چارپائی سے کودا اور باہر کو بے تحاشا بھاگ نکلا۔ نقاب پوشوں نے اس کا تعاقب کیا۔ مگر وہ اندھیری رات کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ انہوں نے غصہ میں رحمو کے گھر کو آگ لگا دی۔ جب آگ کے شعلے آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگے۔ تو گاؤں والوں میں کہرام مچ گیا لوگ رحمو اور اس کے گھر کو بچانے کے لئے بھاگے مگر آگ کے قریب نقاب پوشوں کے روپ میں امیر خاں کے آدمیوں کو دیکھ کر ان کے قدم پیچھے کو پلٹنے لگے تھے۔

ادھر رحمو جاگیردار کے پھیلائے ہوئے جال سے نکل کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بے تحاشہ بھاگا جا رہا تھا۔ اس کا گاؤں اس سے چھوٹ چکا تھا وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔ وہ جاگیردار کے ظلم و ستم سے بہت دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ رحمو کو دور مدھم روشنی نظر آئی وہ اشتیاق سے آگے بڑھنے لگا۔ مدھم روشنی مختلف قسم کی چمکتی ہوئی شعاعوں میں تبدیل ہونے لگی۔ بلند اور اونچی عمارتیں نظر آنے لگیں وہ آگے بڑھتا گیا۔ سورج نے رات کی کالی چادر کو منہ سے اتار کر دھرتی کو جگمگانا شروع کر دیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا۔ شہر اس کے لئے ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ اس نے کبھی بھی اتنی بڑی اور اونچی عمارتیں نہ دیکھی تھیں

وہ اس شہر میں تنہا تھا۔ اس کی منزل نامعلوم تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑا خیالات میں گم تھا۔ کہ ایک اٹھتے ہوئے شور نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ وہ ایک دم چونکا۔ اور سہم گیا کہ کہیں جاگیردار اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کو تلاش کرتے ہوئے شہر میں تو نہیں پہنچ گیا شور مدھم اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دل کسی موہوم خطرے سے گھبرا رہا تھا۔ شور اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ خوشی سے ناچ رہے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں۔ رحمو ان نعروں کا مفہوم نہ سمجھ سکا۔

وہ ابھی حیرت زدہ کھڑا تھا کہ ایک بوڑھے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! اتنے اداس اور حیرت زدہ کیوں ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔ ناچو اور گاؤ" رحمو چونک کر بولا

"کیسی خوشی۔ یہ لوگ انقلاب زندہ باد کے نعرے کیوں لگا رہے ہیں"

"آج ہمارے ملک میں اک نیا انقلاب آیا ہے"

بوڑھا خوشی سے بولا۔ رحمو نے جلدی سے پوچھا۔

"بابا جی! پھر آپ سب لوگ خوشیاں کیوں منا رہے ہیں۔ ہمارے بزرگ تو کہتے تھے کہ انقلاب میں ہزاروں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ شہر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے"

"بیٹا! ذرا صبر سے کام لو۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں" بوڑھے نے رحمو کو تھپکی دیتے ہوئے کہا

(باقی مضمون صفحہ ۳۷ پر درج ہے)

مولانا ابوالحسن عبداللہ نصری

خوش طبعی اور اسلام

اسلام دین فطرت ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کی تعلیمات کے ذریعہ انسان کی سب استعدادوں اور تمام قوتوں کو نشوونما حاصل ہوتا ہے، اور وہ اپنے کمال کو پہنچتی ہیں۔ اس طرح اسلامی شریعت انسانیت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامیہ کو ہم کامل شریعت کہتے ہیں۔

بعض مذاہب کے پیرو خیال کرتے ہیں کہ انسان کے اندر جو طبعی قوتیں قدرت نے ودیعت کی ہیں انکو کچلنا اور مٹانا ہی مذہب کا کام ہے۔ اس بنا پر وہ انسانی طاقتوں کو برا اور ناپاک قرار دیتے ہیں اور زندگی کو ہر قسم کی طراوت شیرینی اور تازگی سے محروم کر دینے کا نام مذہب رکھتے ہیں۔ ایسے ہی مذاہب کے پیروؤں نے اپنے غلط نظریہ کے باعث ایسے طریق اختیار کئے جو فطرت کے خلاف ہیں۔ رہبانیت بھی انہی طریقوں میں سے ہے مگر اسلام نے اعلان فرمایا ہے لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ۔ کہ اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں۔

اسلام زندگی کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس نے انسانی قوتوں کو ان کے غلط استعمال سے بچانے کے لئے کچھ قواعد ضرور بیان کئے ہیں۔ کچھ حدود اور قیود ضرور مقرر کی ہیں مگر یہ سب قواعد اور تمام قیود ان قوتوں کو بہتر اور زیادہ مفید بنانے کے لئے ہیں کچلنے اور مٹانے کے لئے نہیں ہیں۔ بے قید پانی سیلاب بن کر تباہی کا موجب بنتا ہے مگر اسے نہر دن اور رجباہوں کی صورت میں حد بندیوں کے اندر لا کر زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنایا جا سکتا ہے۔ یہی حال انسانی قوتوں پر اسلامی پابندیوں کا ہے وہ انسانی استعدادوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لئے ہیں۔

یہ موضوع بڑا وسیع ہے۔ مگر میں اس وقت انسانی فطرت کی صرف اس قوت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے عرف عام میں خوش طبعی، زندہ دلی، ظرافت اور مزاح کہتے ہیں۔ جو چیز حد سے تجاوز کر کے ضرر رساں بن جاتی ہے اسلام اسے ناپسند کرتا ہے۔ لیکن جس قول یا فعل سے انسان میں شگفتگی پیدا ہو اس کی زندہ دلی کا اظہار ہو، اسکی قوت فکریہ کو فروغ ملے اور اس کے اخلاق و عادات پر اچھا اثر پڑے اسلام، اسے نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اس کے اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے اسی قاعدہ کے ماتحت اسلام نے مزاح اور خوش طبعی کو پسند کیا ہے۔ اور اسے زندگی کا ایک **طبعی تقاضا** قرار دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کی عملی تصویر ہمارے

سید و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
کے وجود باجود میں پائی جاتی ہے۔ یہی معنے اس حدیث
کے ہیں جسے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بایں الفاظ
روایت کیا ہے کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ کہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق قرآن مجید کے عین مطابق
تھے۔ جملہ احکام قرآنی پر آپ عمل پیرا تھے اور ہر اس کام سے
آپ بچتے تھے جس سے بچنے کا قرآن نے حکم دیا ہے۔

احادیث نبویہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
شگفتگی اور مزاح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں اس مختصر
نوٹ میں مشکوٰۃ شریف سے چار احادیث ذکر کرتا ہوں۔

اوّل حضرت انسؓ جو چھوٹے بچے تھے روایت کرتے
ہیں کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخالطنا کہ آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم ہم بچوں کے ساتھ بھی پوری طرح گھل مل جایا
کرتے تھے روایت کے اگلے حصہ میں درج ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام نے حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کو شفقت سے ازراہ مذاق فرمایا
یَا اَبَا عُمَیْرِ مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ کہ میاں ابوعمیر! تمہاری
بلبل کہاں گئی ہے؟

دوم:۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری کیلئے درخواست کی آپ نے فرمایا
اِنِّیْ حَامِلُکَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَۃٍ کہ میں تمہیں اونٹنی کے
بچے پر سوار کرادوں گا۔ وہ شخص کہنے لگا کہ حضور میں نے
اونٹنی کے بچے کو لیکر کیا کرنا ہے۔ میں تو اونٹ چاہتا ہوں
آپ نے فرمایا کہ کیا ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ نہیں ہوتا؟

سوم:۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
عورت سے فرمایا کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہیں جائے گی
وہ خاتون گھبرا گئیں اور حیران ہو کر کہنے لگیں۔ کیوں یا رسول اللہ
ایسا کیوں ہوگا؟ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے
قرآن مجید میں نہیں پڑھا۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم سب
نیک عورتوں کو جوان ہونے کی صورت میں جنت
میں داخل کریں گے۔ پس تم جوان ہو کر جنت میں
داخل ہوگی۔ بڑھیا ہوتے ہوئے داخل نہ ہوگی۔

چہارم:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
روایت کرتے ہیں۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم
کی اس خوش طبعی اور مزاح سے سب صحابہ لطف
اندوز ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ سے کہا کرتے
یا رسول اللہ تداعبنا۔ کہ کیا ہی پرکیف
زندگی ہے۔ کہ آپ بھی ہم سے دل لگی کرتے ہیں
اور ہماری خوش طبعی کے سامان مہیا فرماتے
ہیں۔ حضور نے فرمایا اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا کہ ٹھیک
ہے۔ خوش طبعی اور مذاق تو ہوتا ہے۔ مگر میں کبھی کوئی ناحق
یا دل آزاری کی یا خلاف واقعہ بات نہیں کہتا۔ (ترمذی)

نمونے کی ان احادیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی زندگی کا یہ پہلو نمایاں ہے کہ آپ بسا اوقات اپنے
ساتھیوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں بلکہ بوڑھی عورتوں
تک سے مزاح والی بات کر لیتے تھے تا اس طرح شگفتگی
پیدا ہو اور انسانی زندگی کے ہموم و غموم کو بقدر امکان
ہلکا کیا جاسکے مگر یہ سارا مزاح اور یہ ساری ظرافت ہر قسم کی
اذیت سے پاک ہوتی تھی اور طبائع کیلئے شگفتگی کا باعث بنتی تھی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَی النَّبِیِّ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

شیخ روشن دین تنویر

غزل

چشمِ التفات میں رنگ پیار کا کہاں
درد خواہ ہو تو ہو درد آشنا کہاں

عیش کی فضاؤں میں ہم صفیر تھے بہت
رنج کی نواؤں میں کوئی ہمنوا کہاں

راہ میں ہیں دوزخیں اور بہشت پے بہ پے
دیکھئے اُتر پڑے غم کا قافلہ کہاں

ایک رُخ خزاں سے پُر ایک رُخ بہار سے
نقشِ زندگی کروں دل کا ماجرا کہاں

زد میں آپڑی تو ہے جانِ ناتواں مری
قوتیں حسن ہیں مگر تیرِ بے خطا کہاں

مسکراہٹوں سے پُر ہے فضائے انجمن
میں نے دردِ عشق کا گیت گا دیا کہاں

یاد آ رہا ہے تنویر اپنا رنگ پھر
پر وہ اب ہوا کہاں پر وہ اب فضا کہاں

مولانا مصلح الدین محمد رانجھی

غزل

دل جبتک اپنے ساتھ رہا دُکھ درد کے نالے ساتھ رہے
گردوں میں ستارے اور بھی تھے اس چاند کے ہالے ساتھ رہے

تدبیر کا تیشہ ٹوٹ گیا کوہ کن کا مقدر پھوٹ گیا
فرقت کے ہمارے کٹ نہ سکے اُلفت کے کسالے ساتھ رہے

وحشت سے بیاباں گردی میں یُوں حال بدلتے دیکھا ہے
ان پاؤں کے کانٹے ساتھ ہیں اب جن پاؤں کے چھالے ساتھ رہے

ساحل تو چھٹا تھا پہلے ہی کشتی بھی بھنور میں ڈوب گئی
طوفانِ محبت میں لیکن دریا کے اُچھالے ساتھ رہے

کیا آگ تھی دل میں جانے خدا جو کم نہ ہوئی اور بڑھتی گئی!
گو شام و سحر کے رونے میں برسات کے جھالے ساتھ رہے

اُمید کرم نے تھام لیا مصلح کو جہاں میں گرتے ہی
عصیاں کی اندھیری راتوں میں رحمت کے اُجالے ساتھ رہے

قاضی محمد ظہیر الدین اکمل

رُودادِ شوق

الطافِ کریمانہ ترے یاد کریں گے
یوں ہی دلِ ناشاد کو ہم شاد کریں گے

اب دل میں یہ ٹھانی ہے کہ بے منّتِ احباب
اِک گوشۂ تنہائی کو آباد کریں گے

ٹُوٹے ہوئے دل کی یہ صدا کون سُنے گا
اب آپ ہی آپ ایسے ہی فریاد کرینگے

تم بھُول گئے عہدِ مواسات و محبت
ہم وہ ہیں کہ ہر وقت تمہیں یاد کرینگے

ہر حال میں راضی برضا خوش بقضا ہیں
زنہار کہ ہم شکوۂ بیداد کرینگے

بڑھتے ہی چلے جائیں گے ہم آگے ہی آگے
جو کفر کے ویرانے ہیں آباد کرینگے

ہم عہد نبھائیں گے نبھے جیسے بھی اکملؔ
ہم طرزِ وفا اور بھی ایجاد کریں گے

مبارک احمد عابد

کیوں ...... میرے لئے؟

ہے کلیوں میں آیا ہوا بانکپن
ہے بے خود ہوا جا رہا یہ چمن
مگر سسکیاں کیوں ہیں میرے لئے؟

بہار آئی سارے گلستاں میں آج
عروسِ بہاری کا ہر سُو ہے راج
مگر یہ خزاں کیوں ہے میرے لئے؟

وہ اغیار سے ہوتے خوش ہیں مدام
نہ مانیں گے ہر نامہ بر کا پیام
مگر تلخیاں کیوں ہیں میرے لئے؟

ہے چپ عندلیب آج اُن کے بغیر
ہوا دِل غریب آج اُن کے بغیر
یہ آہ و فغاں کیوں ہے میرے لئے؟

تمنا رہی کہ ہوں راز و نیاز
تصور میں بھی نہ ملے دل نواز
غموں کا جہاں کیوں ہے میرے لئے؟

جواب اِن سوالوں کا پاتا نہیں
تو دل کو مرے چین آتا نہیں

درخشہ ترمذی

غزل

تمہارے نام سے روشن ہے آستانِ غزل
تمہیں تو مہرِ درخشاں ہو آسماں کے لئے

غمِ فراق، غمِ زندگی، غمِ دوراں
ہیں کتنے غم مرے اک قلبِ ناتواں کے لئے

کسی کی برقِ تبسم کی شوخیاں توبہ!
ہزار ہم نے مرے مرگِ ناگہاں کے لئے

وہ سارے راز مرے آنسوؤں نے کہہ ڈالے
بیان جن کا تھا مشکل مری زباں کے لئے

مجھے اس مقام پہ لایا ہے اب جنوں مجھ کو
بہار میں بھی تڑپتا ہوں میں خزاں کے لئے

کسی کی یاد میں ارشد ان آنسوؤں کے سوا
کچھ اور مل نہ سکا اپنی داستاں کے لئے

از پروفیسر نصیر احمد خاں -
ایم۔ایس سی (علیگ)

دل آیا تو رنج و غم و آلام کو پہنچے
آغاز ہوا ہی تھا کہ انجام کو پہنچے

اک عمر گنوا حضرتِ دل راہ پہ آئے
لو صبح کے بھولے ہوئے اب شام کو پہنچے

غم جس نے دیا غم کا مداوا بھی وہی ہے
یہ درد بھی درماں بھی دلآرام کو پہنچے

آفاق پہ رکھ طائرِ دل اپنی نگاہیں
دانے کی ہوس میں تو کہیں دام کو پہنچے

بکھرے ہوئے افشاں کے ستارے جو ڈھلک آئیں
کندن کی دمک عارضِ گلفام کو پہنچے

اک ایک قدم لاکھ تگاپوں سے ہے آگے
یاں کون بھلا وقتِ سبک گام کو پہنچے

منصور کھنچے دار پہ اے خوبیٔ قسمت
جاں دے کے سرِ عشق خوش انجام کو پہنچے

بجھ بجھ ہی گئیں شمعِ محبت کی ضیائیں
گہ نور کو گہ ظلمتِ اوہام کو پہنچے

مستانہ چلی کشتیٔ امید بھنور میں
ہم آیۂ فی البحر کالاعلام کو پہنچے

سو تیشہ لگے پر سلکِ محبت رہی قائم
یہ خوبی توں بھرت و سری رام کو پہنچے

وہ تجھ سے ہیں ناراض یہ معلوم ہے مجھ کو
سب اس کا گنہ حاسدِ نمّام کو پہنچے

جو تم نے کہا ہم نے سنا ٹھیک ہے لیکن
یہ بات اگر شہر کے حکّام کو پہنچے

شعروں سے قلم کرتا ہوں سر اپنے عدو کا
الفاظ مرے بُرّشِ صمصام کو پہنچے

کوندے کی لپک ہو کہ ہو ٹوٹا ہوا تارا
ہرگز نہ مرے توسنِ سبک گام کو پہنچے

پہلی سی نصیر اب نہیں چہرے پہ وہ رونق
کیا تم بھی کسی گردشِ ایام کو پہنچے

پروفیسر نصیر احمد خان۔
ایم۔ اے۔ [illegible]

ہم کو جینے میں بھی شک ہے ساقی ‌‌ ‌‌ کیسی یہ دل کی کسک ہے ساقی
غنچہ غنچہ ہے معطر جس سے ‌‌ ‌‌ کون سے گل کی مہک ہے ساقی
سرو پھر آج ہوا مستِ خرام ‌‌ ‌‌ شاخِ طوبیٰ کی لہک ہے ساقی
نہ بہاریں ہیں نہ گلشن کوئی ‌‌ ‌‌ غنچۂ دل کی چٹک ہے ساقی
زندگی پر کوئی الزام نہ دو ‌‌ ‌‌ اس کو بھی موت زک ہے ساقی
روکنا روکنا دیوانے کو ‌‌ ‌‌ پھر وہی دل کی بہک ہے ساقی
دیکھنا دیکھنا کرنیں پھوٹیں ‌‌ ‌‌ کسی مہ رُو کی جھلک ہے ساقی
ظلم، غارت گری، بیداد، جفا ‌‌ ‌‌ کیا یہ سب جورِ فلک ہے ساقی
کس کی تدبیر سے لرزاں زماں ‌‌ ‌‌ آج ہر انس و ملک ہے ساقی
پھر سنو گے نہ کبھی نامِ وفا ‌‌ ‌‌ یہ مری زندگی تک ہے ساقی

اٹھے برجستگیِ شب پہ نصیر
ساری کوندے کی لپک ہے ساقی

پروفیسر محمد شریف خالد

محبت کے صدقے محبت سکھا دے
محبت کو تو جاودانی بنا دے

میں مسموم ہوں تو ہے تریاقِ خالص
تو الطافِ کامل سے مجھ کو شفا دے

میں کمزور ہوں تو سراپا ہے طاقت
مرے دردِ دل کو تو آہِ رسا دے

تجلی سے کر دے مرا دل منور
ہر اک نقشِ باطل کو دل سے مٹا دے

ہے راہِ فنا میں ہی منزل سرائی
مرے جذبۂ شوق کو تو بقا دے

جمال و محبت کی راز و نیازی
حجابِ دوئی کو بھی یکسر اٹھا دے

وہ اک دردِ شیریں جو تازہ ہو ہر دم
نہ آنکھوں سے نکلے جگر کو ہلا دے

وہ ہیں کون سے خالق اعمال تیرے
کہ جن کے صلے میں تجھے وہ جزا دے